بیاضِ عمر

اور دوسری نظمیں

ستیہ پال آنند

2011

انتساب

بیسویں صدی میں
انگریزی ادب کے دو مایہ ناز شاعروں

ایذرا پاؤنڈ

اور

ٹی ایس ایلیٹ

کے نام
جن کی شعری اور تنقیدی نگارشات نے
اردو نظم نگاری میں اپنا ایک الگ راستہ تلاش
کرنے میں میری رہنمائی کی۔

فہرست

1 عرضِ حال....ایک مختصر دیباچہ

2 بیاضِ عمر

3 23-24April 1564

4 عشائے آخری کا ظرفِ طاہر

5 سورج مکھی کے پھول

6 صورت گر

7 شہپر

8 آخری کوس

9 ایک نیچرل نظم

10 ایک اخلاقی نظم

11 ایک اور اخلاقی نظم

12 خاتمہ بالخیر تو کوئی نہیں ہے

13 حسن اور حیوان

14 ایک بندہ نواز

15 اندھا، گونگا اور بہرہ مر رہا ہوں

16 بڑا اور چھوٹا

17 بھوکا رہنے سے کوئی مرتا نہیں ہے
18 بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم
19 چہروں کی نمائش
20 جل پریاں
21 فَاعتَبِرُویا اولی اَلبصار
22 جنگل میں واپسی
23 لباس
24 ”لوہاکُٹ“
25 علامتی ہوں
26 میرے ہاتھوں میں مقید ایک سورج
27 پارچہ، اک شعر
28 آزمائش شرط تھی
29 فتکلّمُوا تعرَفُوا
30 فرقہِ ستر خوانیہ
31 گیتا گیان
32 چار چہرے گھنٹہ گھر کے
33 گیارھویں انگلی
34 ھل من ناصراً ینصرنا
35 اِنّی کُنت مِنَ الظّٰلمین
36 تہہ شدہ رومال جانے اب کہاں ہے
37 خاکِ شفا

38 لوری

39 میں دو جنما

40 مبازرت Duel

41 میں نے پوچھا تھا

42 میں زاویہ قائمہ نہیں ہوں

43 میتر ایمورس Mater Amoris

44 موزارت۔ سوناتا نمبر ۱۱

45 ساکھشی، شروتی، سمرتی

46 بہ نوکِ خارمی رقصم

47 گیارھواں طاعون

48 کھیت میں کیا بم اگیں گے؟

49 "ریتونادے" یا "چوہوں کا شکار"

50 A Crooked Scenario

51 مختصر مختصر نظمیں

52 موت کو یہ بھی علم نہیں ہے

53 دوسرا راستہ

54 قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

55 اک آیتِ آئندہ

56 ہجرت

57 سکوتِ سخن شناس

58 سکّہ

59 طفلِ سن رسیدہ
60 ایک پہیلی دو جی کو کیسے بوجھے گی؟
61 آرتی
62 وہ کہاں ہے؟

عرضِ حال

ٹی ایس ایلیٹ نے اپنی طویل نظم The Dry Salvages میں کہا ہے:

There is no end, but additions: the trailing
Consequences of further days and hours,
While emotion takes to itself the emotionless
Years of living among the breakage
...Of what was believed in as the most reliable
and therefore the fittest for renunciation.

انت کیا ہے؟ کوئی ہے بھی؟ کہہ تو دیتے ہیں: خاتمہ بالخیر، لیکن کیا نفس بازپسیں ہی قطعی، طے شدہ اختتامیہ ہے؟ مجھے علم نہیں ہے لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جس دن میں شعر کہنا ترک کر دوں گا، وہی دن میرا روزِ انقطاع ہو گا۔ اس کے بعد کا جینا ایک بیکار سا جینا ہے، روز و شب، مہ و سال، لیکن کیسے روز و شب اور کیسے مہ و سال؟ اس کی وضاحت غور طلب ہے۔... میں نے اپنے مرغوب شاعر ایلیٹؔ سے یہ اقتباس صرف

اس لیے لیا ہے کہ سات سو کے قریب نظمیں لکھنے اور گیارہ شعری مجموعوں کی اشاعت کے بعد اب مجھے بھی آخری جنبشِ قلم قریب تر آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ تین چار دہائیاں پیشتر جب میں نے ن۔م۔راشدؔ کی طرح ہی فکشن سے توجہ ہٹا کر نظم نگاری شروع کی تھی تو جو وعدہ میں نے خود سے کیا تھا اس سے میں عہدہ برا ہو چکا ہوں۔ منشی پریم چند کی طرح ہی فصل کو میں نے کھلیان کر دیا ہے۔ جو بات میں اپنے افسانوں اور ناولوں میں نہیں کہہ سکتا تھا، وہ بات میں نے اپنی نظموں میں کہہ دی ہے۔ اب میں ایلیٹؔ کے قول کے مطابق among the breakages میں رہنے کا متمنی ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ جامعات کی سطح پر چار دہائیوں تک شیکسپیئر کا "ہیملٹ" پڑھاتے ہوئے بارہا میں نے اس ڈرامے پر ایلیٹ کے ایک مضمون کا ایک فقرہ دہرایا ہے۔ "فن میں جذبات کے اظہار کا واحد طریقہ ارتباطی معروض کو نشان زد کرنا ہے۔ جذبات کا براہ راست اظہار فن نہیں ہے۔" میں نے ایلیٹ سے صرف یہی نہیں، اور بہت کچھ سیکھا ہے...

گذشتہ نصف صدی سے اردو میں ایلیٹ کے ذکر سے یا اس کے خیالات سے اپنی تنقیدی تحریروں کو معتبر بنانے کی ایک دوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ اس میں ایذرا پاؤنڈ کچھ دب سا گیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ میں نے پیکر تراشی کی تکنیک کو سمجھنے میں ایلیٹ سے بھی کہیں زیادہ ایذرا پاؤنڈ سے اثرات قبول کیے ہیں۔ "ٹھوس اور متحرک امیج" (ایف۔ ایس۔ فلِنٹ) جس طور سے میں نے اپنی شاعری میں استعمال کیے ہیں وہ پاؤنڈ سے زیادہ قریب ہیں۔ ایمی لیول اور ڈی ایچ لارنس بھی اسی فہرست میں شامل کیے جا سکتے ہیں جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ پاؤنڈ نے پیکر تراشی کے چار اصول وضع کیے اور ان پر سیر حاصل بحث کی۔ یہ ہیں۔ موضوع سے منسلک معروضیت کا براہ راست استعمال، اسلوب کی سطح پر (معنی خیز) الفاظ کا چناؤ اور ان کے استعمال میں کنجوسی کی حد تک بخل، پیکر تراشی کے عمل میں صرف بصری لوزمات کو بروئے کار نہ لا کر دیگر حواسِ خمسہ کو 'اپیل' کرنے والے جمالیاتی (نغمگی، موسیقیت، وغیرہ) عناصر کی شمولیت اور ایک وقتی جذبے سے کچھ اوپر اٹھ کر کانسیپٹ کی گنجلک سطح سے حتےّالوسع پرہیز.... میں آج ایک طویل عرصے تک نظمیں لکھنے کے بعد باز آفرینی کی نگاہ جب اپنی تخلیقات پر ڈالتا ہوں تو مجھے یہ سبھی خوبیاں (یا عیوب) نظر

آتے ہیں۔ اس لحاظ سے میں ایذرا پاؤنڈ کا اتنا ہی ممنون ہوں جتنا کہ ایلیٹ کا!

کوئی تیس برس پہلے ”دست برگ“ میں مشمولہ یک صد نظمیں ایک پراجیکٹ کے تحت لکھی گئیں تھیں۔ اس وقت کچھ نقاد حضرات نے ایک سوال اٹھایا تھا کہ کسی طے شدہ پراجیکٹ کے تحت تخلیق کی گئی نظمیں شاید ہی کس معیار کی حامل ہو سکتی ہیں۔ یہ حضرات بھول گئے تھے کی انیسویں صدی کے شروع میں مایہ ناز انگریزی شعرا کالرج اور ورڈزورتھ نے مل کر ایک نپے تلے پلان کے تحت نظموں کے جس مجموعے کی تخلیق کی تھی اسے رومانٹک شاعری کے دور کا مینی فیسٹو تسلیم کیا جاتا ہے اور نصف صدی سے انگریزی شاعری میں اس کا دور دورہ رہا۔ ان یکصد نظموں کے بارے میں یہ بھی لکھا گیا کہ ان میں جو معنیاتی قوس قزح ہے، مشرقی اور مغربی شعری روایت کے درمیان جو جمالیاتی پل بنانے کی کوشش ہے، انگریزی سوچ، ہندوستانی مزاج اور اردو اظہار کا جو جزرومد ہے، جو انوکھا اور نیا ذائقہ ہے وہ اپنی الگ نوعیت رکھتا ہے...... مجھے یہ کہنے میں کوئی خود ستائی نظر نہیں آتی کہ اردو میں اپنی نوعیت کی اپنی الگ شکل میں ’دست برگ‘ میں مشمولہ ایک سو نظمیں اب بڑھ کر سات سو تک پہنچ چکی ہیں۔ ان میں سے چالیس نظموں پر عملی تنقید کے مضامین تحریر کیے گئے ہیں۔ ہندوپاک کے تیس دانشوروں نے ان پر تنقیدی اور تجزیاتی مضامین لکھے ہیں جو ایک مجموعے کی شکل میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ان کے انگریزی تراجم کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے ہندوستانی پنجاب کی حکومت کی طرف سے ان پر ایک لاکھ روپے کا ”شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ“ اور کیلیفورنیا (امریکا) کا پانچ ہزار ڈالر کا بین الاقوامی احمد ادایا ایوارڈ دیا جا چکا ہے.... مجھے اپنے قارئین سے یہ پوچھنا ہے۔ کہ اتنی بڑی قربانی، یعنی ایک چوتھائی صدی تک افسانہ نویسی کے بعد اس صنف ادب کو تلانجلی دے کر کیا میں نے کیا پایا ہے۔ ان تیس پینتیس برسوں کیا میں اردو میں اپنی نوعیت کی اس کوشش کو بدرجہ احسن وخوبی انجام تک پہنچا سکا ہوں یا نہیں؟

آخر میں ایلیٹ سے ہی ماخوذ ایک اقتباس دینا چاہتا ہوں۔

Through the dark cold and empty desolation,

The waves cry, the winds cry, the vast waters

Of the petrel and the porpoise...In my end is my beginning.

(East Coker)

ستیہ پال آنند

بیاضِ عمر

(یہ نثر نُما نظم با قاعدگی سے بحر ہزج مثمن سالم یعنی 'مفاعیلن، مفاعیلن' کی تکرار میں تقطیع کی جاسکتی ہے)

بیاضِ عمر کھولی ہے!

عجب منظر دکھاتے ہیں یہ صفحے جن پہ برسوں سے، دھنک کے سارے رنگوں میں، مرے موئے قلم نے گُل فشانی سے کئی چہرے بنائے ہیں۔ کئی گُلکاریاں کی ہیں۔ لڑکپن کے، شروعِ نوجوانی کے، بیاضِ عمر کے پہلے ورق سب خوش نمائی کے نمونے ہیں۔ گلابی، ارغوانی، سوسنی، مہندی کی رنگت کے یہ صفحے، سات رنگوں کی دھنک کے جھلملاتے وہ مرقعے ہیں کہ جن میں ہمّت و جرآت، تہوّر، منچلاپن، ہر چہ باداباد ہر صفحے پہ لکھا ہے۔ انہی صفحوں پہ وہ گل ریزیاں بھی ہیں، حنا مالیدہ دو ہاتھوں نے جن کی پیار سے تشکیل کی تھی اور وہ رقعے بھی جن میں پیار کا اظہار شعروں میں رقم تھا، میری پہلی عمر کی کچّی بلوغت میں....

بیاضِ عمر کھولی ہے!

عجب منظر دکھاتے ہیں وہ صفحے بعد کے ان چند برسوں کے، کہ جن پہ میری خود آموزی و ذوقِ حصولِ علم نے مجھ کو پڑھائی میں مگن رکھ کر، ادب کے عالمی معیار کا حامل بنایا تھا۔ افادی، نفسیاتی، سائنسی تحقیق کی آنکھیں عطا کی تھیں۔ مجھے لکھنا سکھایا تھا۔ غلط آموز ہونے سے بچایا تھا۔ قواعد، بحث، خطبہ، ناظرہ کی تربیت دی تھی۔ یہ کار آموزیٔ علم و ادب تمرین و مشقِ شعر میں ایسے ڈھلی تھی، مبتدی سے ماہر و مشّاق کہلانے میں بس چھ سات برسوں کا فروعی وقت حائل تھا....

بیاضِ عمر کھولی ہے!

بدلتا وقت، آندھی سا، ورق ایسے پلٹتا جا رہا ہے، مجھ کو لگتا ہے، کوئی اک سال تو بس اک مہینے میں گذر جاتا ہے چپکے سے۔ کئی دن ایسے آتے ہیں کہ اپنی طولعمری میں ہزاروں سال جیتے ہیں....

مرا سویا ہوا ذوقِ تجسس جاگ اٹھا ہے۔ ورق پلٹو تو دیکھو، (مجھ سے کہتا ہے) کسی صفحے کے مخفی حاشیے میں بھی تو کچھ تحریر ہو گا یا کوئی پُرزہ سٹیپل سے جُڑا ہو گا۔ کوئی بُک مارک شاید ہو کہ جس پر گنجلک الفاظ یا واوین میں، بین السطور، امکانیہ معنی رقم ہوں گے۔ مرا ذوقِ تجسس چاہتا ہے اب، بڑھاپے میں یہ پوتھی کھول ہی لی ہے اگر میں نے، تو کچھ بھی رہ نہ جائے میری یادوں کی گرفتِ نارسا سے!....

بیاضِ عمر کھولی ہے!

یہ مخفی حاشیے، یہ خط کشیدہ لائنیں، واوین میں پابند فقرے میرے جملہ قرض کے بارے میں لکھے ہیں۔ ادائی ہندسوں کی فربہ پرتوں میں رقم ہوتی ہوئی میزان تک ایسے پہنچتی ہے کہ ہر 'فردا' سے 'حاضر' تک، ہر اک 'حاضر' سے 'آئندہ' کے دن تک سود ہی در سود ہے جو بڑھتا جاتا ہے۔ یہ قرضے وہ ہیں جو میں اپنے کندھوں پر لیے وارد ہوا تھا، ایک بچہ، بالغوں کی بے ریا دنیا کی جھولی میں۔ کہیں املاک میں، پُرکھوں کے چھوڑے قرض ہیں، جن کی ادائی مجھ پہ واجب تھی۔ یہ سب قرضے ادا کرنا ضروری تھا، مگر کچھ قرض کی رقمیں، بزعمِ خود مری شوریدہ سر طبعِ رسا نے اپنے کھاتے میں لکھی تھیں اپنی مرضی سے۔ یہ راس المال جس کو پیشگی میں نے ادا کرنا تھا، حرف و صوت کا تھا۔ لفظ کی پرتوں کا تھا۔ نظموں کے بحرِ علم میں اک غوطہ زن، غوّاص کا سا تھا۔ یہ قرضہ عالمی انشاء کے اس سلکِ بیاں کا تھا جسے اردو میں ڈھلنا تھا مری نظموں کی صورت میں!....

بیاضِ عمر کھولی ہے....

وہی محنت، مشقت، کاوش و کاہش، عرق ریزی۔ اٹھانا زیست کی بھاری صلیبیں

نوجوانی سے بڑھاپے تک۔ تھکے ماندے، دریدہ پاؤں من من کے، تھکن سے چور گر جانا تو پھر اٹھنا، مسلسل ماندگی سے مضمحل، سانسوں کے سرگم پر پھٹے تلووں سے چلنا، چلتے جانا، قریہ در قریہ۔ وطن سے دور مغرب کی زمیں تک گردشِ پیہم، مسلسل ہجرتیں، خانہ بدوشی، لازمینی، بحر و بر سیر و سیاحت۔ ملکوں ملکوں، شہروں شہروں گھومنا، شب بھر کہیں رکنا تو اگلی صبح چل پڑنا نئے ملکوں کو شہروں کو۔ عناں برداشتہ پا در رکاب آوارگی، عزلت۔

یہ آتشِ زیرِ پا، حرکت پذیری آخرش لائی ہے مجھ کو اپنی جیتی جاگتی قبروں کی سرحد تک... یہ جیتی، جاگتی قبریں مری لامختتم، عمرِ درازو مرتفع کے میل پتّھر پر دہانے کھول کر بیٹھی ہوئی مجھ کو بلاتی ہیں۔

کپِل وستو کا شہزادہ، میں گوتم بدّھ اپنا یہ جنم تو جی چکا ہوں اور شاید اس جنم کے بعد پھر اک اور ہے، اک اور ہے، اک اور ہے۔۔ نروان، تو میں جانتا ہوں، مجھ سے کوسوں دور ہے اب بھی....

بیاضِ عمر کو اب تہہ کروں اور طاق پر رکھ دوں!

....

-24اپریل1564ء

نال لپٹی ہوئی تھی گلے سے

وہ نوزائیدہ جیسے اپنی ولادت سے پہلے ہی

انجام تک جا چکا تھا، مگر
دائی واقف تھی ان حالتوں سے...
اٹھی، اور جلدی سے کمرے میں چاروں طرف
ایک قینچی کو ڈھونڈھا
نہیں مل سکی، تو
پلٹ کر جھکی، خون آلود لپٹی ہوئی نال کو
اپنے دانتوں سے کاٹا، گلے سے ہٹایا
تو بچے نے اک جھر جھری لی
ذرا بلبلایا کہ جیسے شکایت کے انداز میں کہہ رہا ہو
مری کیا ضرورت تھی دنیا کو آخر؟
بچا کر مجھے کیا ملے گا کسی کو؟
فقط عام سا ایک نوزائیدہ طفل ہی ہوں!

کہا زچّہ کو دائی نے...
...لو، تمہارا یہ ولیم ہے، اس کو سنبھالو!

....

ایک غیر ضروری نوٹ: 23/24 اپریل کی درمیانی رات 1564ء
ولیم شیکسپیئر کا یومِ پیدائش ہے۔
تین سو اکسٹھ برس بعد اسی رات کو ستیہ پال آنند کی ولادت ہوئی۔

دیوجِنیس

Greek cynic philosopher and ascetic Diogenes (412?-323? BC)

میں تو کلبی ہوں
اگر پھولوں کی خوشبو آئے
تو مری آنکھیں کسی گلبدن، گلرخ سے پرے
ایسے تابوت کی متلاشی سدا رہتی ہیں
جس پہ پھولوں سے گندھی لڑیاں ہوں تعزیت کی!
مجھ کو تو بازار میں چلتے ہوئے افراد کے سر
الٹی ہانڈی سے نظر آتے ہیں، کالے، مکروہ
باغ میں بچوں کی کلکاریاں، گلگشت میں مصروف جواں
"بوسہ بازی" میں مگن بنچوں پر بیٹھے جوڑے
ایسے لگتے ہیں کہ عفریت بچھل پائیاں ہوں
رات آتی ہے کسی عضوِ معطل کی طرح
دن نکلتا ہے تو شمشانوں سے راکھ اڑتی ہے
پاؤں پر ٹانگیں رکھے، ٹانگوں پہ دھڑ گٹھڑی سا
اور سر ڈھال میں محفوظ کسی کچھوے سا
یونہی سوتا ہوں میں ہر اک صبح پھر اٹھنے کے لیے
اور اٹھتا ہوں تو یرقان زدہ دنیا کے
رنگ سب زرد نظر آتے ہیں، بیمار، علیل!

ہو گی اس دنیا میں رعنائی بھی، زیبائی بھی
زیب وزینت بھی، نفاست بھی، دلآرائی بھی
میرا مشرب ہے مگر ان سے بہت دور، کہ میں
ایک احوّل کی طرح
سب کو بس دیدہ و دانستہ غلط دیکھتا ہوں!

....

1980ء میں اپنی سیماب صفت پادر رکاب سیاحت کے دوران میں یونان کے صوبہ Macedonia کے شہر Amphipolis میں پہنچا۔ یہ وہ شہر ہے جہاں فلپ دوئم کے ہاں سکندر اعظم کی ولادت ہوئی۔ یہاں دیو جِنیسؔ کے نام کا کتبہ ایستادہ ہے جہاں ہزاروں سیاح پہنچتے ہیں۔ یہ نظم وہاں خلق ہوئی اور اب پرانے کاغذات سے برآمد ہوئی۔ میری ڈایری میں ایک اندراج ہے۔ ”چاہے ایک دن کے لیے ہی سہی، جی چاہتا ہے، میں Diogenes کلبی کی نظر سے دنیا کو تو دیکھوں کہ کیسی نظر آتی ہے۔ اور پھر اس دنیا کی تصویر کشی نظم کی صورت میں کروں۔“

عشائے آخری کا ظرف طاہر

(The Holy Grail of the Last Supper کے زیر عنوان یہ نظم پہلے انگریزی میں لکھی گئی)

عشائے آخری کا ظرفِ طاہر ڈھونڈھتا ہوں میں
مسیحائے زماں ہوں، بیس صدیاں پیشتر ہی

اس مسافت پر چلا تھا آج کے دن
اس زمینِ پاک سے، جس پر
لہو پیہم برستا آ رہا ہے اُس مرے پہلے بڑے دن سے!

سموم و ریگ کے طوفان
میرا تاج کانٹوں کا اڑا کر لے گئے ہیں۔۔۔ اور
اندھیرے کی سلاخیں مجھ کو اندھا کر گئی ہیں
آنے والے سب دنوں تک!
سکوتِ مرگ میں، طوفانِ ظلمت میں
مرے شاگرد سارے سو گئے ہیں خوابِ غفلت میں
مرا ساتھی نہیں ہے کوئی بھی ان بیس صدیوں سے رواں صحرا نوردی میں
مگر میں پا شکستہ، تن دریدہ چلتا جاتا ہوں
مرے کاندھے پہ ان سب کی صلیبیں ہیں جنہیں اس دشت گاہی میں
مرے ہمراہ ہونا تھا، مگر سب مجھ سے پیچھے رہ گئے ہیں

میں اپنے ہاتھ دونوں عرش کی جانب اٹھاتا ہوں
کہ تاریکی میں کوئی اک ستارہ ہی
عشائے آخری کا ظرفِ طاہر ہو
فلک پر اڑ کے جو تاروں کے جھرمٹ میں
کہیں گم ہو گیا تھا بیس صدیاں پیشتر
جب قطرہ قطرہ اس میں میرا خوں ٹپک کر بھر گیا تھا ایک ہی شب میں

کہاں وہ شب، کہاں یہ بیس صدیاں بعد کا ''اب''؟
فرق ہے دونوں زمانوں میں
کہ پچھلی بیس صدیاں تو
لہو کے ذائقے سے اس طرح مانوس ہیں جیسے
عشائے آخری کی اس رکابی سے ابھی تک
نسلِ انساں کی کہانی کے ورق پر
خوں برستا ہو!!

....

سورج مکھی کے پھول۔ شاعر

وقت اور دوزخ نے دن کو
دھند میں دفنا دیا ہے
اور آدم خور گِدھّوں کی طرح
اڑتے ہوئے بادل کے طاغوتی عزازیلوں نے
اپنا راستہ بھولے ہوئے سورج کو انگلی سے پکڑ کر
سرحدِ افلاک سے باہر کیا ہے

جب سے سورج تیرگی کے غار میں
درد و تعب سے پھڑ پھڑاتا
گم ہوا ہے
وقت جیسے رک گیا ہے
کس طرف دیکھیں گے اب
سورج مکھی کے پھول اپنے
بھولے بھالے خوشنما چہرے اٹھائے؟
سُوریہ پرنام کرکے شبد کا رس پینے والے
ہومرؔ وَورجِلؔ یا ولیم شیکسپیئرؔ
تب یقیناً مرتے جائیں گے گھنی گہری اندھیری
سرد تاریکی میں دب کر!

....

(مرکزی استعارہ جزوی طور پر ٹی ایس ایلیٹ کی The Burnt Norton سے ماخوز)

صورت گر

کچی مٹّی
میرے اندر
خود ہی اک بُت کی صورت میں

ڈھلنے کو تیار ہے، لیکن
میرا چاک تو مجھ سے باہر گھوم رہا ہے

میں اندر کی 'ان گھڑ' مورت
خود سے باہر کیسے لاؤں؟
کیوں میں اپنی کوکھ کی جنّت سے آدم کی کچی مٹّی
اس دنیا میں اتاروں، جس میں
کوزہ گر کہلانے والا
کوئی حسن ؔتیار کھڑا ہے
جو یہ آدھی ادھوری مورت
صدیوں پرانے، ٹوٹے پھوٹے چاک پہ رکھ کر
اک وحشی حیوان کے قالب میں ڈھالے گا!

....

شہپر
(گلزارؔ کے لیے)

اس کو خود بھی تو کچھ معلوم نہ تھا
لوگ یہ بات سمجھتے کیسے ؟
پرِ پرواز ابھی نازک تھے
صغر سن طفل تھا
ریعانِ بلوغت سے بہت قبل مگر
اونچا اڑنے کے لیے
بال و پر تولتے رہنا ہی تھی عادت اس کی
اور پھر ایک دن ایسا ہی ہوا

جیسے شہباز کا ننھا بچہ
اونچی چوٹی پہ کہیں بیٹھا ہوا
یک بیک جست بھرے
اور افلاک کی لا سمت بلندی میں کہیں
دور تک اڑتے ہوئے
آنکھ سے اوجھل ہو جائے....
اس نے پر کھول کر اک جست بھری
اور اڑتا ہی گیا!

اس کو پہلے تو یہ معلوم نہ تھا
زندگی بھر کی مگر اونچی اڑانوں کے بعد
اس کو احساس ہے اب

اس کے شہپر کی بُنت کاری میں
بالِ جبریل بھی شامل تھا کہیں!

....

آخری کوس

آخری کوس مجھے آج ہی طے کرنا ہے
اور اس لمبے سفر کا یہ کڑا کوس مجھے
اس قدر لمبا بڑھانا ہے کہ اب سے پہلے
جو بھی کچھ گذرا ہے ماضی میں، اسے پھر اک بار
"حاضر" و "ناظر" و "موجود" سا میں جھیل سکوں
عرصۂ غائب و معدوم سے اس لمحے تک!
وادیاں، جھرنے، چراگاہیں، مویشی، پنچھی
کھیت، کھلیان، چھپر کھٹ، مرے گھر کا دالان
گاؤں کی گلیاں، مکاں، لوگ، دکانیں، بازار
اور پھر شہر کی سڑکیں، بسوں، کاروں کا شور
عمر بڑھتی ہوئی بچپن سے لڑکپن کی طرف
اور لڑکپن کی وہ ناپختہ بلوغت جس میں
مجھ کو احساس ہوا تھا کہ کوئی اور بھی ہے
زندگی ساری جسے ساتھ مرے چلنا ہے!

کیسا شوریدہ سر طوفان تھا، طغیانی تھی
جس نے اک باؤلے انسان کو بے رحمی سے
دور انجانے سے پردیس میں لا پٹخا تھا
اور پھر پابہ رکاب آگے ہی آگے کی طرف
سر پہ سامان اٹھائے ہوئے بنجاروں سا
ڈنڈی، پگڈنڈی، سڑک، نقل و حمل، حرکت و کوچ
کیسی آیند و روِد تھی یہ مہم جُو ہجرت
جس میں سیماب قدم چلتا رہا ہوں برسوں

ایک کوس اور مجھے آج کی شب چلنا ہے
اور اس رات فقط اپنی ہی صحبت میں اگر
جو بھی میں بھوگ چکا ہوں اسے صہبا کی طرح
آخری کوس کے اس جام میں بھر کر آنندؔ
ایک لمحہ بھی توقف نہ کروں، ہاتھ میں لوں
اور اک گھونٹ میں پی جاؤں تو میرا یہ سفر
سرخروئی سے مکمل ہو، مجھے سیر کرے!

آخری کوس مجھے آج ہی طے کرنا ہے!!

....

ایک "نیچرل" نظم

(خواجہ االطاف حسین حالی کے ایما پر لکھی گئی)

آخری سطور میں کیا راز افشا ہوتا ہے۔۔۔ یہ دیکھیں۔

سہانی نیند کی آغوش میں مچلتی ہے
نشے کے آبگیں محور پہ جسم گھومتا ہے
ہر ایک عضو میں رقصاں ہے رات بھر کا خمار
جو گھنگھروؤں سے بدن کا خمیر گوندھتا ہے!

ذرا سی کہنی کے بل اٹھتی ہے تو چاروں طرف
پرندے راگ للت کے سُروں میں بولتے ہیں
شبِ گزشتہ کے خوابوں کے محرمانہ راز
چہکتے، گاتے، فجر کی زباں میں کھولتے ہیں

سڈول بازو اٹھاتی ہے تو سرکتے ہوئے
اندھیرے دھند کی چادر میں چھُپنے لگتے ہیں
بڑے ہی ناز سے لیتی ہے ایک انگڑائی
تو جیسے بلبلے رگ رگ سے پھوٹ پڑتے ہیں

کمر کے بل میں کھنچاؤ ہے اک کماں جیسا
کھنچے تو جسم میں قوسیں مچلنے لگتی ہیں
بھنور سی ناف کو جب گدگدی سی ہوتی ہے
ہنسی کی گھنٹیاں پانی میں بجنے لگتی ہیں

ابھار سینے کے، اٹھتے، مچلتے، کھلتے ہوئے
کہ جیسے جام میں کچھ دائرے سے رقصاں ہوں
کنول کے پھول کھلیں سطحِ آب پر جیسے
کٹورے سیمگوں جھیلوں میں جیسے افشاں ہوں
سپید و سرخ بدن کی وہ نرم پشتِ دوتا
کہ جیسے ریشمی چٹّان خود میں بٹ جائے
دراز ٹانگیں اٹھی ہیں بہاؤ میں ایسے
غزل کا شعر اٹھے اور بزم الٹ جائے!

جو سوئی سوئی سی بہتی رہی ہے پچھلی رات
ندی، وہ چلبلی دوشیزہ جاگ اٹھی ہے!!

....

ایک اخلاقی نظم

(مولانا اسمٰعیل میرٹھی کے ایما پر لکھی گئی)

جسم کا وجدان جب پورا ہوا۔ تو
استغفر اللہ کہہ کر تیرا گاہک
زہد کا پکّا، مگر اخلاق کا مارا ہوا اک "نیک" انساں
احتیاطاً دائیں بائیں جھانک کر
یوں تیرے بالا خانے کی وہ سیڑھیاں
(جن کو سدا سے اس کے پاؤں جانتے ہیں)
چو کسی سے، دھیان سے اترا ہے
جیسے انخلا، انزال ہو آلودگی کا
اور پھر سرعت سے اپنے گھر کی جانب چل دیا ہے۔
پاؤں اک کیچڑ میں دھنس جاتا ہے تو
لاحول پڑھتا ہے کہ شیطاں کو بھگائے
اک قدم آگے بڑھا کر لمحہ بھر رکتا ہے
پھر واپس تری کھڑکی کی جانب دیکھتا ہے
(جانتا ہے تُو اسے جاتے ہوئے بھی دیکھتی ہے)

تُو جو کھڑکی میں کھڑی

گاہک کو اپنے دیکھتی ہے، جانتی ہے
اب یقیناً روز کے معمول کے مانند
وہ نالی پہ بیٹھے گا
فراغت پا چکے گا تو جھٹک کر، پھر کھڑا ہو کر
کہیں سے ڈھونڈھ لے گا
کوئی ڈھیلا، گول پتھر، نرم کنکر
خشک استنجا کرے گا
اور پتھر کو گھما کر ایسے پھینکے گا کہ جیسے
زانیوں، اغلامیوں کی سنگساری کر رہا ہو
یا عزازیلوں کی پوری فوج کو
جمرہ میں اپنی ضربِ کاری سے شکستِ فاش دے کر
سُرخرو مسجد کی جانب جا رہا ہو!
تُو جو کھڑکی میں کھڑی ہے
نیک ہے، اخلاق کا نادر نمونہ!
تیرے سینے میں نجانے کتنے مردے دفن ہیں....
جو صرف تجھ سے بولتے ہیں
داورِ محشر تجھے عفو و معافی کی جزا دے، نیک بی بی!

....

ایک اور اخلاقی نظم

(''منو سمرتی'' کے خالق اور ذات پات کے موجد منُو کے ایما پر لکھی گئی)

جسم کی ترِشنا • مٹی تو • (پیاس)
''رام، جے بھگوان'' کہہ کر، تیرا گاہک
(نیچ جاتی کو فقط چھونے سے ہی ناپاک ہو جو، ذات کا ایسا برہمن)
اے ہری جن •، نیچ عورت (اچھوت)
جھونپڑی تیری سے، آدھی رات کو یوں جھینپتا نکلا ہے، جیسے
کوئی دیکھے گا تو پرلے • کا سماں آجائے گا • (قیامت)

کون سی پستک میں لکھا ہے، اسے یہ یاد تو بالکل نہیں ہے
پر وہ اتنا جانتا ہے
نیچ جاتی کی کسی عورت سے گر سمبھوگ (• جنسی فعل)
کرنا ہو تو اس کو
پان کے پتّے کو گنگا جل سے دھو کر
ساتھ لے جانا پڑے گا
اور شودر جات کی عورت کی نابھی • پر یہ پتہ (• ناف)

رکھ کے ہی سمبھوگ کے اس پاپ سے بچنا پڑے گا

تُو جو شُودر جات کی نادار، بے بس
اور جواں عورت ہے، سب کچھ جانتی ہے
باپ بھی، بھائی بھی اس اونچے پجاری خانداں کے
پان کے پتّوں کو گنگا جل سے دھو کر
تیری "ناپاکی" سے بچنے کا طریقہ جانتے ہیں
تیری کٹیا سے نکل کر "رام، جے بھگوان" کہتے
گھر پہنچتے ہی سبھی نِشچنت • ہو کر (بے فکر)
نیند کی وادی میں کھو جاتے ہیں مندر کے پجاری
پو پھٹے مندر میں پوجا کے لیے جانا ہے ان کو!

اے ہریجن جات کی "ناپاک" عورت
پاکبازی میں ترا ثانی نہیں ہے
جانے کتنے پان کے پتّوں میں تیرے پُن • چھپے ہیں (• ثواب)
دیوتا تیرے تجھے وردان • دیں، نردوش عورت! (• جزا)

....

(یہ نظم پہلے ہندی میں لکھی گئی)

حسن اور حیوان

(ایک نظم جو بیس برسوں میں بھی مکمل نہ ہو سکی)

Beauty and the Beast..

کون تھا وہ؟
کوئی اگلا؟ کوئی پچھلا؟
کون تھا وہ؟
کوئی پچھلا جس نے تم کو
پہلی کچی عمر میں زخمی کیا تھا؟
اور پھر ہنستا ہوا، بازو چھڑا کر
تم سے رخصت ہو گیا تھا؟
(جانور ہنستے نہیں ہیں، تم نے سوچا بھی تھا، لیکن
روتے روتے تم بھی شاید ہنس پڑی تھیں!)

آج تک تم
کتنے ماہ و سال اس کے بس کی تلچھٹ
(ایک کڑوی یاد کے مانند جیسے)
اپنے اندر گھول کر پیتی رہی ہو

(اور اک امید پر جیتی رہی ہو!)

آج پکی عمر میں اک بار تم سے
پھر اگر وہ آملا ہے
تو سمجھ لو
'حسن اور حیوان' میں اک باہمی رشتہ ہمیشہ سے رہا ہے
اور وہ اک دوسرے کو
شیکسپیئر کے زمانے سے ابھی تک
ڈھونڈتے آئے ہیں۔۔۔
(1990ء نامکمل)

....

ایک بندہ نواز

نوٹ۔۔۔ برُوٹس کی سوانح تو کھلی کتاب کی طرح ہے، لیکن ایاز کے سلسلے میں تاریخی مواد حاصل کرنے کے لیے بہت دقّت کا سامنا کرنا پڑا۔ فرشتہ کی تاریخ (ہر دو حصص) اپنی وسعت پذیری کے باوجود تشنۂ تکمیل ہے۔ کشمیر میں تحریر کردہ ''راج ترنگنی'' سے کچھ شواہد دستیاب ہوتے ہیں، لیکن ڈاکٹر بدھ پرکاش کی کرو کشیتر یونیورسٹی کے کتب خانے میں پنجاب کے قبیلوں اور ذات برادریوں کی بابت کتاب کا مسودہ معلومات کا ایک نادر ذخیرہ ہے۔ اس میں دیرینہ مخطوطات کی اسناد سے محمود غزنوی کا احوال نامہ موجود ہے۔ زر خرید غلام کے طور پر ایاز کا بارہ سونے کی اشرفیوں کے عوض میں خرید اجانا ایک طے شدہ امر ہے۔ محمود غزنوی

کے حرم میں ۹ بیگمات تھیں جن سے ۶۵ بچے ہوئے۔ بتّیس کنیزوں اور گیارہ غلام لڑکوں کے لیے الگ الگ احرام تھے۔

اگر برُوٹس کی طرح خنجر سے
اپنے ’بندہ نواز‘ کی سب ’نوازشوں‘ کا حساب
چکتا نہ کر سکا تو
ایازؔ محمودؔ سے بھلا کیسے بچ سکے گا؟

کسی مورّخ کو علم ہے کیا
کہ بارہ مہروں کے عوض ہی تا حیات
بیچا گیا تھا اک طفلِ خوبرو
جو ایازؔ تھا..... اور اس کا بندہ نواز اس کو
حرم کی زینت بنا کے سمجھا تھا
اس کا محبوب، راحتِ جاں، ایاز بھی اس کے عشق میں
مبتلا ہے ایسے کہ جیسے وہ خود ہے
عاشقِ زار قند پارہ سا، اس غلامِ جمیل و گلگوں کا!

قدیم روما کے گوشواروں میں درج کیا ہے؟
کہ صاحبِ اقتدار ہر وقت پاس رکھتے تھے
کشف بردار، نوجواں، طرحدار خادم
تو کیا تعلق تھا فاتح و کامران سیزرؔ کا نوجواں، خوبرو برُوٹس سے....؟

دوست کا؟ پیرو کار کا؟ یا چہیتے دلبر کا؟ کون جانے
کہ کیا حقیقت تھی، کیا فسانہ!

افاغنہ کے غلام کو جو کوئی بتاتا
رہائی کا راستہ فقط آستیں میں پوشیدہ ایک خنجر ہے، تو پھر یقینا
وہ اپنے 'بندہ نواز' کی سب نوازشوں کا جواب دیتا!

....

اندھا گونگا اور بہرا مر رہا ہوں

نطق بے آواز تھا
پگھلا ہوا سیسہ مرے کانوں کو بہرا کر چکا تھا
صرف میری کور آنکھیں ہی تھیں
جو گونگی زباں میں بولتی تھیں
جب بھی میں بے نور آنکھوں کو اٹھا کر بات کرتا
مورتی سنتی، مگر خاموش رہتی
مورتی مندر میں استھاپت نہیں تھی....
اس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے گھڑا تھا
اور پھر اِکلویہؔ • کی مانند اپنے سامنے رکھ کر

میں اس سے بات کرتا تھا، جھگڑتا، یا کبھی روتا، کبھی ہنستا
کبھی درویش سا میں
اس کے چاروں سمت اک پاؤں گھماؤ میں پھنسا کر ناچتا تھا!

خودکُشی کی شام میں نے مورتی سے
صاف لفظوں میں کہا، ''معبود میرے!
میرا یہ حرکی تصّور ہے کہ میں خود فہم بھی ہوں
اور رکھتا ہوں میں اپنی ذات کے اندر چھُپا کر
اپنی افزائش کا سامان
اپنے ہونے یا نہ ہونے کا جوازِ مستقل بھی
مردِ خود آگاہ ہوں
میری یہی تکمیل ہے، میں جانتا ہوں
اندھا، گونگا اور بہرا مر رہا ہوں
خودکشی سے پہلے یہ خواہش ہے میری
اب مرے اگلے جنم، جتنے بھی باقی رہ گئے ہوں
پنچ جاتی میں ہوں تو، بھگوان، میں آواگون سے چھوٹ جاؤں!

....

پرانے وقتوں میں شودر (اچھوت) کے کان میں اگر بھولے سے بھی وید منتر کی آواز پڑ جائے تو اس کی سزا یہ تھی کہ اس کے کانوں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے اور اگر وہ وید منتر کا جاپ کرے تو اس کی زبان کاٹ دی جائے۔ یہ کہانی شودر جاتی کے بھگت سمتانن کی ہے جو تیسری صدیء میں اجّین کا باسی تھا۔ وہ جنم سے نابینا تھا لیکن مندر کے پیچھے چھپ کر وید منتروں کا پاٹھ سنتا تھا اور دہراتا تھا۔

بڑا اور چھوٹا

(اپنی ایک ہندی نظم کا سیدھا اور سادہ اردو روپ)

آٹھ سالہ طفل مجھ کو دم بخود سا دیکھتا ہے
"واقعی؟ سچ مُچ؟" وہ مجھ سے پوچھتا ہے
"واقعی جب بھی کبھی تم طیش میں آتے ہو
تو صبر و تحمل کی جگہ، بے صبر ہو کر
کانپنے لگتے ہو
اور پھر جوش میں آ کر فشارِ خون اپنا
تیز کر لیتے ہو.... میں تو۔۔۔"

"تم بتاؤ،" میں نے پوچھا، "کوئی تم کو کشٹ دے، تو تم
بھلا دھیرج سے، اطمینان سے کیسے رہو گے؟"
"میں تو، صاحب،" آٹھ سالہ بچہ بولا
"بردباری سے ذرا پیچھے ہٹوں گا
اور کدورت تھوک کر گھر لوٹ جاؤں گا....
ہنسوں گا اس غصیلے شخص کی اگیانتا پر
جس نے مجھ کو دکھ دیا ہے!"

یاد آیا

میں نے بھی شاید یہی سب سیکھ کر
آرام سے بچپن، لڑکپن اور جوانی
(یعنی اپنی آج تک کی زندگی)
شاداں و فرحاں، یوں بسر کی تھی جیسے خلد ہو، لیکن
بڑھاپے میں نہ جانے کیا ہوا ہے
جو میں اتنا کینہ پرور، بے بصیرت ہو گیا ہوں؟

تب مجھے کچھ یاد آیا، اور یکایک
آٹھ سالہ خوبرو لڑکے کو میں نے غور سے دیکھا، یہ پوچھا
"کون ہو تم؟"

"دیکھ خود کو آئینے میں
اے مرے ستّر برس کے
اونچے قد والے وجودِ آشکارا!
تم بڑے ہو کر تو مجھ سے
اپنے قد میں اور چھوٹے ہو گئے ہو!!"

بھوکا رہنے سے کوئی مرتا نہیں ہے (؟)

کافکا۰ کہتا ہے ۰(شاید طنز کی دُہری زباں میں Kafka (
بھوکا رہنے سے کوئی مرتا نہیں ہے!
آٹھ دن بھوکا رہا تھا، روس کا گوگولؔ، دیکھو ۰۰
مر نہیں پایا تو اپنے پیٹ کے بل
رینگ کر دیوار تک پہنچا کہ سر ٹکرائے
چھٹکارا ہو اپنی زندگی سے
کافکا کہتا ہے، بھوکا موت کو آواز دے، تو
موت بھی کانوں کو اپنے بند کر لیتی ہے فوراً
بھوک سے مرتے ہوئے اک شخص کو واجب ہے
اپنی پنڈلیوں کو کاٹ کھائے
بازوؤں کا گوشت دانتوں سے چبائے
اپنے خوں کا قطرہ قطرہ چاٹ ڈالے
گوشت اپنا ہو، پرایا، گوشت آخر گوشت ہی ہے
اور اس کے پیٹ کا تنّور ایندھن کو جلانا جانتا ہے ۰

کافکا کو کیا کوئی سمجھائے
(نٹ ہیمسن ۰۰۰ کی سیدھی سادی بولی میں) کہ بھوکا مر نہیں سکتا، مگر باہر نکل کر مار تو سکتا ہے
موٹی توند والے گوشت کے بیوپاریوں کو!

....

Knut Hamson•••Nikolai Gogol••Franz Kafka•

(نوٹ) کافکاؔ کی کہانی Metamorphosis کا کردار گریگور آچھا بھلا محنتی کاریگر تھا جب اسے یہ عجیب مرض لاحق ہوا اور اس نے خود کو ایک عظیم الجثہ، عجیب الخلقت بسیار خور مکوڑے کی شکل میں تبدیل کر لیا اور آخر میں جب کھانے کو کچھ نہیں ملا تو وہ بھوک سے مر گیا۔ مندرجہ بالا الفاظ کافکاؔ کے ایک انٹرویو سے لیے گئے ہیں جس میں اس نے اپنی بھوک کی allegory کا دفاع کیا۔

بو علی اندر غبارِ ناقہ گُم •

میں اگر شاعر تھا، مولا، تو مری عہدہ برائی کیا تھی آخر؟
شاعری میں متکفل تھا، تو یہ کیسی نامناسب احتمالی؟
کیا کروں میں؟
بند کر دوں اپنا بابِ لفظ و معنی؟
اور کہف کے غار میں جھانکوں، جہاں بیٹھے ہوئے
اصحاب معبودِ حقیقی کی عبادت میں مگن ہیں
اور سگِ تازی سا چوکیدار، ان کے پاس بیٹھوں
وحدت و توحید کا پیغام سُن کر ورد کی صورت اسے دہراتا جاؤں؟
پوچھتا ہوں

کیا مری مشقِ سخن، توحید کی ازلی شناسا

قرض کے بھگتان کی داعی نہیں ہے؟

میں تو راس المال سارا پیشگی ہی دے چُکا ہوں

قرض کی واپس ادائی میں

مرے الفاظ کا سارا ذخیرہ لُٹ چکا ہے

شعر کو حرف و ندا میں ڈھالنا

تسبیح و تہلیل و عبادت سے کہاں کمتر ہے مولا؟

"شاعری جزویست از پیغمبری"..... کس نے کہا تھا؟

میں تو اتنا جانتا ہوں

میری تمجید و پرستش لفظ کی قرآت میں ڈھلتی ہے

تو پھر تخلیق کا واضح عمل تسبیح یا مالا کے منکوں کی طرح ہے

پھر خیال آتا ہے شاید میں غلط آموز ہوں

جو شعر گوئی کو عبادت جان کر اِترا رہا ہوں

"بو علی" ہوں، جو "غبارِ ناقہ" میں گم ہو گیا ہے!

• بو علی اندر غبارِ ناقہ گم: دستِ رومی پردۂ محمل گرفت۔ (مولانا روم)

چہروں کی نمائش

(غالب کی نیک روح سے معذرت کے ساتھ)

اس نمائش گاہ میں یہ کیسے چہروں کی نمائش تھی
جنہیں پہچاننا مشکل تھا مجھ سے
کچھ تو دیواروں پہ لٹکے، منہ چڑاتے بندروں کے تھوبڑے تھے
گھوڑیوں سے ہنہناتے چند چہرے عورتوں کے
اپنی چتون، ناک نقشے، ناز نخرے اور چھب سے
مُنہ دکھائی مانگتے تھے
ایسے سکّے بھی تھے جو اک چہرۂ شاہی کی خاطر
اپنے اصلی روپ، نکھ سکھ، ناک نقشے کو بدل کر
اک نیا استر چڑھا کر
کچھ بھی بننے کے لئے دیوار پر لٹکے ہوئے تھے

رُک گیا میں..... اور پوچھا

کیا مرے منہ پر بھی کوئی خول چڑھ سکتا ہے بھائی
جس سے یہ معلوم ہو، میں نامور، ممتاز شاعر ہوں
مرا ثانی نہیں ہے شہرت وصولت میں کوئی؟
دم بخود، دیوار پر لٹکا ہوا غالب کا چہرہ بول اُٹھا

منہ نہ کھلواؤ مرا، اے کھتری بچّے••
اپنے چلّو میں ذرا پانی بھرو اور اس میں اپنی شکل دیکھو!
مجھ سے گر ملتی نہیں۔ تو ڈوب جاؤ!!

....

••غالبؔ نے اپنے ہمعصر اور حریف ہندو شاعر قتیلؔ کو تضحیک آمیز لہجے میں ''کھتری بچہ'' کہا تھا۔

جل پریاں

مانےؔ (Claude Monet-1840-1926) کی پینٹنگ Nympheas کا ایک شعری تاثر

نہاتی ہوئی
خوش نمائی سے، نخوت سے
کچھ غیر مجوب، کچھ بے تکلف
یہ اندر سبھا کی کج انداز پریاں
جو مانےؔ کی تصویر میں خندہ زن
غسل کے موج میلے میں اٹھلا رہی ہیں
خوشا، مرحبا، میری اس نظم کی شانِ تخلیق ہیں

نہاتی ہوئی
جھیل کے پانیوں میں چٹانوں پہ نازک بدن تھرتھراتے ہوئے

یہ تعلّی، رعونت سے اٹھی ہوئی شیشہ وش گردنیں
جیسے شفاف الماس، یاقوت گھڑ کر بنائی گئی ہوں
سہاگن کوئی باکرہ سی کنواری
بیاہی ہوئی شعلہ زا آگ جیسی اچھوتی
برہنہ بدن سادگی کی حریری قباؤں میں لپٹا ہوا، بے تصنع
عجب آب و آتش کا سنگم۔ بھڑکتا، جھلکتا، چمکتا، سجیلا!

اگر پیرِ صد سالہ بھی دیکھ لے یہ مرقعے نسائی بدن کے
تو شاید
مصور کی مانند (یا شاعرِ نظم گو کی طرح)
پھر جوانی کی مستی سے سرشار ہو
(شرط بینائی کی ہے!!)

....

فَا عتَبِرُوُ یا اولی اَلبصار

کیا بصیرت، کیسی بینائی، کہاں کی پیش بینی؟
جانتے بھی ہیں کہ دشمن کون ہے لیکن سبھی پنبہ دہن ہیں
دائیں بائیں دیکھتے سب ہیں مگر پہچاننا اک چیستاں ہے

کون مارِ آستیں ہے؟ کس نے پھن کاڑھا ہوا ہے؟
دور بیں سے دیکھنے میں محو ہیں، شاید عدو گاؤں کے باہر خیمہ زن ہو
گوش بر آواز ہیں شاید کہیں سے
قاتلوں کی نعرہ بازی کان میں پڑ جائے تو پھر
خندقیں کھودیں، صفیں باندھے کھڑے ہوں
سانپ تو موجود ہے دالان میں کُنڈلی جمائے

اپنا فن کاڑھے ہوئے پھُنکارتا ہے
کیوں نظر آتا نہیں ہم کور چشموں کو، کہ ہم نے
ان "خوارج" کو کہیں تاریخ کے دیرینہ صفحوں سے مٹا کر
یہ قضیہ مکتبی بحثوں میں الجھا کر ہمیشہ کے لیے گُم کر دیا تھا
پیش اندیشی تھی ہاتف کی کہ جس نے یہ کہا تھا
یہ "خوارج" جب اُٹھیں گے
نیستی، اتلاف، تخریب و تباہی ساتھ لا کر
راکھ کر دیں گے گھر کو!

آنکھیں کھولو اور عبرت کا سبق لو!!

....

جنگل میں واپسی

میں جنگل میں کبھی آباد تھا
پیڑوں کی آبادی میں ان کے سنگ اُگتا تھا
جڑیں میری سلامت تھیں
مگر لاکھوں برس پہلے جڑیں ٹانگوں میں بدلیں، تو
نباتاتی حکومت نے
مجھے 'جنگل نکالا' دے کے یہ تلقین کی.... جاؤ
تم انسانوں کی بستی میں رہو، پھولو، پھلو
جنگل تمہاری نسل کا مسکن نہیں، انساں!
میں شہروں میں چلا آیا تو تھا، لیکن
میں جنگل کو بھی اپنی روح میں محفوظ رکھ کر ساتھ لایا تھا!

جڑیں جب کٹ گئی ہوں، کوئی
جنگل کو کہاں تک اپنے اندر روح میں رکھے؟
جڑوں سے ٹوٹ کر اپنی
میں اب تک تو رہا ہوں سرگراں باہر کی دنیا میں
مگر اب تھک گیا ہوں....
لوٹ جانا چاہتا ہوں اپنے جنگل میں!

لباس تیس بتیس برس پہلے لکھی ہوئی ایک نظم

سر کے پیچھے دونوں آنکھیں کھل گئیں
تو اُس نے دیکھا
لوگ سب ننگے ہی اپنی دھُن میں چلتے جا رہے ہیں
آتی جاتی اس امڈتی بھیڑ میں
دو چار ایسے بھی ہیں
جو انجیر کے پتّوں سے مادر زاد عریانی کو اپنی
ڈھانپ کر رکھےّ ہوئے ہیں
جو برہنہ ہیں
وہ سب نادیدہ پوشاکوں کو سہلاتے ہوئے یوں چل رہے ہیں
اپنی خوش وضعی کی جیسے خود نمائی کر رہے ہوں

اس نے سر اپنا گھمایا
پوری گردن جونہی چرخی کی طرح گھومی تو اس نے
سامنے کی دونوں آنکھیں کھول دیں
حیرت سے دیکھا
بھیڑ میں سب لوگ تو پوری طرح ملبوس ہیں
وہ خود ہی ننگا چل رہا ہے۔

"لوہاکُٹ"

دھونکنی کی مشک کے دو پھیپھڑوں میں
بِلبِلاتی ڈائنوں جیسی ہوا کو قید کر کے
دونوں ہاتھوں سے دبا کر جب وہ بھٹّی پھُونکتا ہے
اس کو شعلوں کے بھڑکتے دل میں اپنے تخت پر بیٹھا ہوا
آہن گروں کو پالنے والا نظر آتا ہے جس کو
رہتی دنیا سے فقط لوہار ہی پہچانتے ہیں
''لوہاکُٹ'' یہ جانتا ہے
اس کے آہن گر قبیلے کا اگر کوئی خدا ہے
تو وہ اس کی شعلہ زا بھٹّی
پگھلتے سُرخ رُو لوہے کی ڈلیوں
اور ہتھوڑے میں نہاں ہے

اس خدا کی اپنی اک خوشبُو ہے، اپنی واشنا ہے
جو بھڑکتی آگ میں مشکوں کی دونوں ڈائنوں کی چھاتیوں سے پھُوٹتی ہے

اور اس خوشبُو کو اس کے پھُولتے نتھنے
برابر سُونگھ کر، پہچانتے ہیں

جب بھی لوہے کی دہکتی سُرخ رُو پتلی ڈلی کو وہ دمادم کُوٹتا ہے
آگ میں بیٹھے خدا سے پوچھتا ہے
وہ جو اک زندہ ڈلی تھی، اب کہاں ہے؟
میری لوہارن تو کب کی مر چکی ہے!

....

'ملامتی' ہوں اے

نماز میں نہیں پڑھتا، نہ روزہ رکھتا ہوں
مجھے قبول ہے تادیب و لعنت و دشنام
میں عیب جو ہوں، نکوہش ہے میرا طرزِ حیات
محمدت ہے مجھے قابلِ نفریں، کہ مرا
شعارِ زیست ہے تضحیک، ذلّت و تحقیر
ثنا، دعا، درود و سلام مجھ پہ حرام
نظر میں اپنی بھی مجرم ہوں، موردِ الزام
قصیدہ خواں نہیں اللہ کا بھی، بد گو ہوں

میں سب کی نظروں میں نفرت کا اہل ہوں، لیکن.....

کسی کو کیسے بتاؤں کہ میں بھی مومن ہوں
مرا خضوع اکیلے میں، اعتکاف میں ہے
میں اپنے حجرے میں اپنے بدن کو پیٹتا ہوں
میری سکت مری افتادگی پہ پلتی ہے
’ملامتی‘ تو ہوں لوگوں کے واسطے لیکن
میں خود ہی اپنا بھی ملزم ہوں، روسیاہ، خبیث!

کئی دنوں سے مگر میں ہوں ایک الجھن میں
مری انا، مرا خود کام حبِّ ذات و نفس
مری ہی راکھ سے ققنس کی طرح اٹھے ہیں
غلط نہ ہو گا اگر میں کہوں کہ اب مجھ سے
مری انا کے تقاضے بھی رد نہیں ہوتے!

ملامتی بھی ہوں لیکن میں خود پرست بھی ہوں
میں اس تضاد کی دنیا میں کیسے زندہ رہوں؟

۱(فرقۂ ملامتیہ کا ایک رکن)

میرے ہاتھوں میں مقید ایک سُورج

رات کے پچھلے پہر یہ معجزہ کیسے ہوا تھا؟
آفتاب آکاش کے پچھلے کنارے سے کھسک کر
رات کی تاریکیوں سے ڈرتا ڈرتا آ آ اپنی آب و تاب، اپنی روشنی، اپنی تمازت
پوٹلی میں باندھ کر لایا
مری سوکھی ہوئی مریل ہتھیلی پر اسے رکھا
مری مُٹھّی کو جبراً بند کر کے چل دیا، تو مجھ کو جیسے ہوش آیا

لاکھ کوشش کر چکا ہوں، بند مُٹھّی بند ہے، کھُلتی نہیں ہے
جگمگاتی روشنی مُٹھّی سے کوندوں کی طرح باہر لپک کر

اپنی آب و تاب سے آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے
تابکاری کے شرارے اُنگلیوں سے پھوٹتے ہیں
شہر کے سب لوگ بھی اس معجزے کو دیکھتے ہیں
اپنی ساری عمر تو یہ شخص تاریکی کی چادر کو لپیٹے جی چکا ہے
عین پیری میں بھلا یہ معجزہ کیسے ہوا، وہ پوچھتے ہیں
ایسی شہرت، یہ جلال و شان و شوکت
اس زوالِ عمر کے مارے ہوئے بوڑھے کو مل سکتی ہے

یہ کس کو پتہ تھا!

میرے ہاتھوں میں مقید میرا سورج
خاک آسودہ مرے ہی ساتھ ہو گا
قبر سے بھی روشنی پھوٹے گی، اتنا جانتا ہوں

....

پارچہ، اک شعر

(غالبؔ کی نیک روح سے معذرت کے ساتھ)

پارچہ الوان، ست رنگا، چمکتا
بھیگتے رنگوں کی ململ
دھوپ اور برسات کا جیسے ملن ہو
کھٹا میٹھا، آسمانی، سبز، نیلا، زرد، اُودا
پارچہ رنگین، بو قلمون، روشن!

پارچہ!
جذبات کے سب رنگ

اپنے دل کی دھڑکن میں سمیٹے، شاعرِ ادراک کے
جب ذہن میں ابھرا تو اک تصویر سا تھا
یوں لگا شاعر کو جیسے
سانس کی آشفتگی، شوریدگی، حساسیت
رنگوں کی بارش میں برہنہ تن کھڑی
سیراب ہوتی جا رہی ہو

پارچہ!
اک جذبۂ خوش کن تھا، اور تصویر سا ابھرا
تو شاعر نے عجب اک تجربے کے عنکبوتی جال میں
الجھا کے اس کو
تولیے سا ہاتھ میں لے کر نچوڑا
رنگ سارے۔۔۔۔ اور ان کی
گنگا جمنی، شعلہ وش، زربفت رنگینی

کہ جو وجدان کے اظہار کی معروضیت تھی
یوں نچوڑی اور بہادی
جیسے یہ اشکال سب لاحق، اضافی، ثانوی ہوں
اور ان کا پارچے کی بیخ و بُن سے انخلا ہی شاعری کا ماحصل ہو

رنگ سارے دھُل گئے
قوسِ قزح مایع ہوئی اور بہہ گئی

رنگ جب غائب ہوئے، تو
لفظ و معنی کی ہنر مندی کے ماہر
شاعرِ ادراک نے اس کو نفی، اثبات جیسے
ہیولائی، غیر مادی فلسفے سے بھر دیا
رنگین، خوش کُن پھول کو کاغذ کی مَیلی کترنوں سے جڑ دیا
قافیہ بندی کے مکڑی جال میں الجھا کے گویا
شاعری کا فرض پورا کر دیا

پارچہ!
خاکستری، جذبے کی مائیت سے عاری، خشک، بے رس
رمز، تشبیہ و علامت سے مگر اک حاملہ عورت سا بوجھل
اب ہمارے سامنے اک شعر کی پژمردہ صورت میں کھڑا ہے
مالکِ مفہوم و معنی
غالبؔ باریک بیں نے
کھردرا، شکنوں کا مارا چیتھڑا سا
جو ہمارے سامنے پھیلا دیا ہے
اس کی تفسیریں لکھے جائیں گے ہم اب رہتی دنیا تک، مگر
وہ پارچہ جو جذبۂ خوش کن تھا

اور شاعر کے تخلیقی افق پر
سر سراتی لہر سا وارد ہوا تھا!
اب مدوریت کے حلقوں میں کہیں گم ہو گیا ہے۔

....

آزمائش شرط تھی

زندہ رہنا سیکھ کر بھی میں نے شاید
زندگی کو دُردِ تہہ تک
پی کے جینے کی کبھی کوشش نہیں کی!
پیاس تھی۔۔پانی نہیں تھا
صبر سے شکر و رضا کے بند حجروں میں بندھا
بیٹھا رہا۔۔۔اور حلق میں جب پیاس کے کانٹے چبھے، تو
سہہ گیا میں!
میرے گھر والوں نے، میرے بیوی بچوں نے بھی
جلتے ہونٹ سی کر، پیاس کے کانٹوں کو سہنے
صبر سے شکر و رضا کے بند حجروں میں
تڑپنے کا سبق سیکھا مجھی سے!
یہ سراسر بزدلی تھی، اُن سے دھوکا تھا

کہ میں نے خود کو پہچانا نہیں تھا!

میں بھی موسےٰ کی طرح
غصّے میں اپنی آستینوں کو چڑھاتا
اور عصا کی ایک کاری چوٹ سے
چٹّان کے ٹکڑے اگر کرتا
تو شاید بازیابی کے عمل میں مجھ پہ کھلتا
رہبری کا فن۔۔۔ نبوّت کا کرشمہ
پیاس سے ہلکان لوگوں کے لیے پانی کا چشمہ!
آزمائش شرط تھی
میں نے کبھی پوری نہیں کی!

....

فَتَکلّمُوا تُعرَفُوا

(کلام کرو تاکہ پہچانے جاؤ..... حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

طبیب بھنبھا گیا
میں سب علاج کر کے تھک گیا ہوں پر یہ بچہ بولتا نہیں
زبان اس کی تندرست ہے
کہیں بھی کوئی رخنہ، کوئی نقص، میں نہیں سمجھ سکا
بدن بھی تندرست ہے مگر یہ نونہال چار سال کا
اشاروں سے ہی بات کرنا جانتا ہے، کیا کروں؟
اسے کسی سپیشلسٹ کے پاس لے کے جایئے!
یہ میں تھا چار سال کا!
مری زبان بند تھی
کلام مجھ سے جیسے چھن گیا تھا پہلے دن سے ہی
جو دو برس کا مجھ سے چھوٹا بھائی تھا وہ خوب بولتا تھا، پر
میں صم بکم تھا، بے زبان، دم بخود
کہ. جیسے چُپ کا روزہ رکھ کے جی چکا تھا چار سال کی یہ عمرِ مختصر

عجیب معجزہ ہوا کہ ایک دن
میں اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں صم بکم کھڑا ہوا
تماشہ دیکھتا تھا اک جلوس کا
علم اٹھائے جس میں لوگ "یا حسین" "یا حسین" کہتے
سینہ پیٹتے، لہولہان... جا رہے تھے
اور میں...... جسے زبان آوری کا کچھ پتہ نہ تھا
نہ جانے کیسے اس سکوت کے اندھیرے غار سے نکل کے بول اٹھا...

"حسین! یا حسین! یا حسین!!"

.... اور پھر مرا سکوت

نطق میں، کلام میں، سخن میں ڈھل گیا

میں صاف بولنے لگا!!

(لکھنؤ میں سنی ہوئی ایک سچی کہانی کی شعری داستان)

....

فرقۂ دستر خوانیہ

نان نفتہ، سادہ پانی ہی تھا اس کے گھر میں تو احباب کتراتے تھے اس سے

بھولا بھٹکا آ بھی جاتا تھا کوئی تو

باولی ہنڈیا کی سبزی، دال دلیا ہی تھا دستر خوان کا الوانِ نعمت!

آقوا پیورا ہی تھا یا پھر کالی چائے ہی فقط نوشیدنی تھی Aqua Pura!

اب اسے سرکارِ عالی سے ملا ہے اک خزانہ

بے بضاعت اردوئے مفلس کے نامِ معتبر پر

ایک کرسی

ظاہراً اردو کی ترویج و ترقی کے لیے، پر

بالحقیقت اس کے اپنے واسطے یا بھائی بندوں کی بھلائی کے لیے ہی!

اس کے دستر خوان پر اب ملنے والوں

شاعروں، کالم نویسوں، دوستوں کی حاضری تو بڑھ گئی ہے.... ساتھ اس کے
کیک، بسکٹ، جَیم، جَیلی، پیسٹری اور ٹوسٹ بھی موجود رہتے ہیں
کہ کوئی یہ نہ سمجھے دال روٹی پر گذارا چل رہا ہے۔
جانتا وہ خوب ہے کہ اس کے سارے دوست
مخلصانہ خیر خواہی کے لیے آتے تو ہیں، پر
اس کا دستر خوان ہی ان دوستوں کا جاری وساری ہدف ہے
فرقۂ اردو اگر اب صرف دستر خوان کا فرقہ ہی بن کر رہ گیا ہے
تو بھی، اردو کے بہی خواہو، یہ سمجھو
نام تو اردو کا زندہ ہے ابھی تک!

....

(شاعر کا روئے سخن کسی فردِ واحد کی طرف نہیں ہے)

گیتا گیان

میں تو اب بھی بول رہا ہوں
سننے والا کوئی نہیں ہے!

خاموشی کی 'لانگ گرامر' ا۔
یا ذہنی تصویروں کا مابعد اسطور ۲۱۔

کس کس سے میں صوت و ندا کے
کُن فیکون میں بات کروں گا
میں کہ خدائے صور و صدا ہوں
اب بھی اک لاصوت اندھیرے چاہ میں
اک جلتی مشعل سا
آگ کی لپٹوں کی بھاشا میں

اک ویاکھیان دیے جاتا ہوں
اپنا گیان دیے جاتا ہوں

کوئیں کے باہر
لاکھوں ارجن آس کی منڈیر پہ
اپنے دھنُش زمیں پر رکھے
چپ بیٹھے ہیں
لیکن سب بہرے ہیں شاید!

....

۱ Long Grammar
۲ Meta-Myth

چار چہرے گھنٹہ گھر کے

چار چہرے گھنٹہ گھر کے
چار گھڑیاں
گھنٹہ گھر جو چار سڑکوں کی لپکتی، بے تحاشا دوڑ کے سنگم پہ
سر اونچا کیے یوں ایستادہ ہے کہ جیسے
بھاگتی، بے دم بسوں، کاروں کو اپنے گرد چلتی چیونٹیوں سا دیکھتا ہو

چار چہرے گھنٹہ گھر کے
اور اس کی چار گھڑیاں!

اک گھڑی رفتار میں یکساں ہے....
اک جانب رواں ہے
وقت کی چوٹی پہ چڑھتی ہے تو بارہ تک پہنچ کر
سِسی فُس کی طرح نیچے کو لڑھکتی
چھ کی کھائی میں اترتی ہے تو پھر اک بار
اونچے نردباں کا زینہ زینہ
خندہ پیشانی سے چڑھتی
اپنی پر اسرار منزل ڈھونڈھتی ہے

دوسری کچھ ایسی کوتاہی سے چلتی ہے کہ جیسے
اس کی سوئیاں الٹی جانب بڑھ رہی ہوں
وقت کی یک سمت حرکت اس کے مسلک میں نہیں ہے
تین ہوں یا نو بجے ہوں، سات ہوں یا اک بجا ہو
وقت کی یکسانیت یا ثانویت ایک سی ہے
اس گھڑی میں پیشگی یا واپسی کچھ بھی نہیں ہے
حال ماضی میں مقید اور مستقبل میں مدغم
ایک وحدت، مجموعہ ہے!

تیسری کے وقت کا واحد وسیلہ
دیکھنے والے کی نظروں میں نہاں ہے
دیکھنے والا اگر چاہے کہ بارہ ہی بجے ہوں
تو گھڑی بارہ بجاتی ہی نظر آئے گی اس کو!
اس گھڑی کے پاس اک ہمدرد دل ہے
جو اسے ناظر کے دل سے جوڑتا ہے

اور چوتھی اپنی ٹن ٹن کے سہانے گیت میں ایسے مگن ہے
اس کو سوئیوں کو چلانے کی کوئی فرصت نہیں ہے
ٹھس کھڑی دن رات اک گھنٹہ بجاتے
رک گئی ہے
اس گھڑی کی دونوں سوئیاں بارہ کی چوٹی پہ چڑھ کر

ایک سوئی بن گئی ہیں

گھنٹہ گھر کے چار چہرے اور اس کی چار گھڑیاں
وقت کی نا منقسم وحدت کی شاہد
اپنا اپنا سچ دکھاتی چل رہی ہیں!

....

گیارھویں انگلی

(ساقی فاروقی کے لیے)

ایک دہائی، دس کا عدد، دہ چند تھا
میں بدنامِ زمانہ تھا، مجھ پر
دسیوں جانب سے انگشت نمائی کے حملے ہوتے تھے
لیکن، میں تو ڈھیٹ تھا.... استغنا کی حد تک شاکر تھا
خوش تھا اپنے "دس انگلی دس سر راون کے" نام و لقب پر
ایک سے بڑھ کر اک انگلی سر تا پا عمل تھی
دس نوکر چاکر میری خدمت کرتے تھے
پتہ چلا جب گیارھویں انگلی بھی اُگ آئی
(ہاتھ پہ تھی یا اور کہیں، یہ علم نہیں ہے)

لیکن یہ انگشتِ رسا سب پر حاوی تھی
اُولیٰ، اصلی، سر نامہ نوشاہِ جوانی کے خط کا!

ہوا وہی جو گیارھویں انگلی کے اُگنے پر مذکورہ تھا
سخت، کڑی، ہیرے کی کنی، نیزے کی انی
جابر، ناترس... یہ انگلی اُگتے ہی جیسے خودکار ہو گئی
میں اس کا محتاج ہو گیا
اس کا آلۂ کار بن گیا
باقی کی دس
انگشتانوں میں لپٹی جیسے ناکارہ، نااہل ہو گئیں۔

ساٹھے پاٹھے تک تو میری گیارھویں انگلی خوب چلی، پر
نصف صدی کے بعد مجھے جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا
سرخرو وہ گیارھویں انگلی
جو کل تک شہ زور تھی، منہ پھٹ، آگ بجھوکا
بیسی کھِسی سی پژمردہ، ضعف سے ٹھس، بے ہوش پڑی ہے
سکت نہیں ہے اٹھنے کی بھی!

باقی کی دس پہلے سے ہی لنگڑی لولی، دھان پان تھیں
ان سے میں اب کیسی توقع رکھ سکتا تھا!

ساٹھے پاٹھے کی نادانی، لوگو، مجھ کو مار گئی
گیارھویں انگلی زیست کی بازی ہار گئی
میں تو، لوگو، ٹھگا گیا!

....

هل من ناصرًا ينصر نا

میں نہیں چاہتا ٹوٹنا پھوٹنا
میرا ڈھانچہ تو اس چکنی مٹّی کا ہے
جو مرا کوزہ گر گوندھ کر مجھ کو
اک ظاہری وضع، اک شخصیت دے گیا
عزو بندی مری شیشہ وش ہے، اسے
ٹوٹنے سے بچائے گا اب کون، اے کوزہ گر؟
میرے چاروں طرف حملہ آور عدو ہیں ہتھوڑے اٹھائے ہوئے
مفسدوں، حاسدوں کے گروہوں کا بس ایک ہی عزم ہے
مجھ کو توڑیں، مجھے ریزہ ریزہ کریں
جان سے مار دیں

کوزہ گر، تو نے جب

مجھ کو تشکیل دی تھی تو اتنا تو کرتا
مجھے اک مبارز بناتا
مرے ہاتھ میں ایک تلوار دیتا
کہ اپنی حفاظت مرا کام ہوتا
مگر میں نہتّا، اکیلا کھڑا دیکھتا ہوں
عدو چاروں جانب سے یلغار کرتے ہوئے آ رہے ہیں

میں نہیں چاہتا ٹوٹنا پھوٹنا، میرے مولا، مرے کوزہ گر!

....

(یہ دعایہ نظم اہلیہ کی وفات کے بعد Deep Depression کے دنوں میں لکھی گئی)

محفلِ اردو

اِنّی کُنتُ مِنَ الظّٰالمِین

کہا کس نے ستم کے دن کبھی دائم نہیں رہتے؟
(خدا کو ماننے والا وہ شاعر جو مرے اندر نہاں ہے۔۔ پوچھتا ہے)
کہا کس نے کہ استبداد اک ضمنی حقیقت ہے؟
کہا کس نے تشدد، بربریت، کم بقا کچھ سانحے سے ہیں

ہمیشہ جو نہیں رہتے
فقط نیرنگ ہیں... کچھ دن رہیں گے
اور پھر داد و ستد، انصاف کی فرمانروائی لوٹ آئے گی؟
مگر میں دیکھتا ہوں ہر طرف بس ایک منظر ہے
(وسیع القلب انساں جو مرے اندر نہاں ہے، پھر یہ کہتا ہے)
عوام الناس سر کو نیوڑھائے، منہ چھپائے
عاجز و مسکین بیٹھے ہیں
سبھی خوّاص اپنی بے مروّت خود نمائی میں
انانیت سے ایسے دندناتے پھر رہے ہیں
جیسے مالک ہوں جہاں کے!

ہوا کیا ہے؟
مرے مولا کہ ہم جو عاجز و مسکین ہیں
اپنی جبیں سائی میں یوں مصروف ہیں
اتنا بھی دل گردہ نہیں رکھتے
کہ ان فرعون زادوں سے یہ پوچھیں، کون ہو تم؟
مگر یہ حوصلہ کب ہے کسی میں؟
لوگ تو ٹوٹے ہوئے دل کے کٹورے سامنے رکھے
سبھی رنجور بیٹھے ہیں
کہ جب قبریں بلائیں گی تو سر پر خاک اوڑھیں گے!

تہہ شدہ رومال جانے اب کہاں ہے!

گھر بنانے میں اسے برسوں لگے تھے
سب سے پہلے گھر کی بنیادوں کے پتھر
پانچ دریاؤں کے چٹیل ساحلوں سے چُن کے لایا
ان پہ اپنا نام کندہ کر کے بنیادیں بنائیں
چار دیواری کھڑی کی
طاق، دروازے، تراشیدہ دریچے اور روشندان جڑ کر
دھوپ سے، تازہ ہوا سے گھر کو جیسے ذی نفس کی زندگی دی!

اور پائیں باغ کی پھر ابتدا کی
سبز پودے، گلبدن لہراتی بیلیں
تتلیاں، بھنورے، پرندے صبح کی شبنم
سہانی سردیوں کی دھوپ کے ٹکڑے سنہرے
اور بچوں کے لیے قوسِ قزح سا ایک جھولا!

آسماں کا ایک ٹکڑا کاٹ کر

چو کور سا رومال کی مانند پھیلایا
نئے گھر اور پائیں باغ کو اس میں لپیٹا.......

.......اور پھر وہ چل دیا
ان دور کے ملکوں میں جن میں سال کے بارہ مہینے
اک ٹھٹھرتی رُت، سمٹتی دھوپ، یخ بستہ ہواؤں کا چلن تھا!

اب زوالِ عمر کا مارا ہوا وہ ایک بوڑھا
برف زا موسم میں سردی اوڑھ کر بیٹھا ہوا ہے
تہہ شدہ رومال جانے اب کہاں ہے؟

کون ہے وہ ستیہ پال آنند صاحب؟

....

خاکِ شفا

(ڈکٹر امجد حسین سے کے توسط سے پشاور کی ایک مٹھی خاک ملنے پر)

سجدہ ریز ہوا میں
قشقہ کھینچا اپنے شہر کی اس مٹی سے
جس نے مجھ کو جنم دیا ہے

کیا سوندھی خوشبو ہے، کیسا لمس ہے، کیا ٹھنڈک ہے اس کی!
مٹی جو سڑکوں، بازاروں
گلیوں، کوچوں
اور گھروں کے کچے صحنوں اور چھتوں سے
اڑتی اڑتی سات سمندر پار کئی برسوں سے مجھ کو ڈھونڈھ رہی تھی
اب میرے گھر تک پہنچی ہے
اس مٹّی میں رچی بسی ہے
میرے پرکھوں کی جانی پہچانی خوشبو
اس مٹّی میں بول رہے ہیں
گھر، گلیاں، روزن، دروازے
دیوریں، چھجے، پرنالے
سب کہتے ہیں
ہم تو نصف صدی سے اپنی آنکھیں کھولے جاگ رہے ہیں
رام بھی بنباسی تھے، لیکن
چودہ برس گذرنے پر وہ اپنی اجدھیا لوٹ آئے تھے
تم کیسے بنباس سدھارے
نصف صدی تک لوٹ نہ پائے!
اور میں بد قسمت پردیسی
ہجرت مارا
پاؤں شکستہ، اک بنجارہ
اپنی مجبوری کی زنجیروں میں بندھا ہوا زندانی

سات سمندر پار کی اس بے رحم زمیں پر
بے گھر بیٹھا سوچ رہا ہوں
خاکِ شفا کی پڑیا کو ٹکیہ میں ڈھالوں
گرہ میں باندھوں
اور اپنا دمساز بنا لوں!

....

لوری

ماں کی لوری کی پلکوں میں
ایک ستارہ اٹک گیا
گود میں سوئے ننھے بچے کو دیکھا، تو
بھٹک گیا
پیچھے سے اک اور ستارہ
لوری کے اک سسکی بھرتے بول کی سنگت میں
ہچکولے لیتا آیا
اٹکے، بھٹکے، رکے ہوئے تارے سے بولا
ڈھلک بھی جاؤ

میرے پیچھے لمبی ایک قطار کھڑی ہے
سب تاروں کو
ماں کی لوری کی پلکوں سے ٹپک ٹپک کر
بچے کے تپتے ماتھے کو
اپنی ٹھنڈک سے دھونا ہے

ٹوٹتے تارے پلکوں کی جھلمل چلمن سے
جھانک جھانک کر آخر سمجھ گئے تھے....
ماں کو صبح ہی پتہ چلا تھا
پچھلی رات کو
خودکُش حملے میں گھائل ہو جانے والا
اس کا خاوند اسپتال کے باہر ہی دم توڑ گیا ہے!

....

میں دو جنما

آج کا دن اور کل جو گذر گیا۔ یہ دونوں
میرے شانوں پر بیٹھے ہیں
کل کا دن بائیں کندھے پر جم کر بیٹھا
میرے بائیں کان کی نازک لو کو پکڑے

چیخ چیخ کر یہ اعلان کیے جاتا ہے
”میں زندہ ہوں! بائیں جانب کندھا موڑ کے دیکھو مجھ کو!“
آج کا دن جو
دائیں کندھے پر آرام سے پاؤں پھیلا کر بیٹھا ہے
بار بار دھیمے لہجے میں ایک ہی بات کو دہراتا ہے
”مت دیکھو اس اجل رسیدہ کل کو
جو اب کسی بھی دم اٹھنے والا ہے!
مجھ کو دیکھو، بات کرو، میں چلتا پھرتا آج کا دن ہوں
سانس کی ڈوری مجھ سے بندھی ہے
کیا لینا دینا ہے اک آسودۂ خاک سے ہم جیسے زندوں کو؟“
دائیں بائیں گردن موڑ کے دونوں کی باتیں سنتا ہوں
گردن میں بل پڑ جاتا ہے
کچھ ستا کر پھر سننے لگتا ہوں ان کی رام کہانی!

شاید سچ کہتے ہیں دونوں!
ماضی بھلا کہاں مرتا ہے؟
زندوں سے بھی بدتر، یہ مردہ تو ذہن میں گڑا ہوا ہے
جیسے کالے مرمر کی سل کا کتبہ ہو
اور پھر آج کا زندہ پیکر؟
آنے والے کل کے دن تک اس کو میں کیسے جھٹلاؤں؟

کوئی بتائے

میں دو جنما

اپنے دو شانوں پر بیٹھے آج اور کل سے کیسے نپٹوں؟

....

DUEL(مبازرت)

میں اک مبارز

میں سینکڑوں معرکوں کا ثابت قدم، مہم جُو

شجاعت و حوصلے میں جی دار

آج پیری میں اپنا خم ٹھونک کر کھڑا ہوں

کہ جیسے عہد شباب میں تھا

میں رزم گاہِ حیات میں اپنی تیغ و تیر و تفنگ سے لیس

مستعد ہوں

مجھے پتہ ہے

کہ سامنے نیم وا در یچے کے پیچھے میرا

وہ دشمنِ زیست کنکھجورا نکیلے، زہریلے ڈنک اٹھائے

کھڑا ہوا منتظر ہے میرا

کہ جیسے ہی در کھلے، وہ مجھ پر اچھل کے جھپٹے

مرے بدن کو ہزاروں ڈنکوں سے گُودڈالے!

یہ کنکھجورا اے
جو خود میں ہی کشت وخون کی ایک
چلتی پھرتی مشین ہے، میرے جسم پر
اس سے پیشتر بھی جھپٹ چکا ہے
ہزاروں زہریلے ڈنک پہلے بھی
میری نس نس میں اپنے نشتر چبھو چکے ہیں

مگر میں نا قابلِ ہزیمت وہ سورما ہوں
سپہ گری میں جسے ہمیشہ غنیم پر جیت ہی ملی ہے!
یہ دُشمنِ جاں، حریف میرا
ہر ایک خونریز معرکے میں
گریز پا، اپنے ڈنک سارے سمیٹ کر
اور پیچھے ہٹ کر پلٹ گیا ہے!

مگر مرے واسطے یہ روزِ حساب ہے
ایک فیصلہ کُن مقابلہ ہے
کہ جس میں شمشیر زن یہ پیرِ شجاع
لوگوں کے سامنے ایک رزم گہ میں
تباہ کُن، ہولناک موذی کے بالمقابل

مُبازرت میں

duel میں دشمن کو چِت کرے گا!

....

(طویل علالت کے دوران لکھی گئی)

میں نے پوچھا تھا!

”ہاں، چھیاسی مرتبہ آیا ہے

صدقے اور خیراتوں کی بابت ذکر، لیکن

کون اس سب آیتوں کو یاد رکھتا ہے جہاں میں؟“

میں نے پوچھا تھا

مبارک ماہ ہے رمضان کا، تم جانتے ہو؟

میں نے پوچھا تھا۔ فلاحِ عام کے کاموں کی خاطر

اس مبارک ماہ میں تم کیا کروگے؟

کچھ خدا ترسی کی رو سے خیر خواہی؟ خدمتِ خلقت؟

زکوٰۃ و فضل و فیاضی؟

کوئی صدقہ؟ کوئی خیرات؟ کوئی عاطفت؟

عالمی اردو

بھوکوں کو کھانا؟
دان پُن؟ بخشش فلاحی راہ میں؟
معذور لوگوں کی کسی تنظیم کو چندہ، وظیفہ؟
جانتے ہو کتنی ترجیح و تواتر سے ہیں
قرآں میں یہ سب احکام، بھائی؟

اور جواباً جو مجھے اس نے کہا تھا
میں نے ان الفاظ کو واوین میں دہرا دیا ہے۔

....

میں زاویہ قائمہ نہیں ہوں!

میں زاویہ قائمہ نہیں ہوں
میں گھٹتا، بڑھتا، بدلتا رہتا ہوں
خاک داں ارض سے فلک تک
فلک سے واپس زمیں کی جانب!
'الِف' سے (اللہ سے) شروعِ سفر ہو، تو پھر
حروفِ ابجد میں 'یائے مجہول' میری منزل ہے

اور 'یے' سے.... 'الِف' تلک واپسی سفر ہے
بدی سے نیکی کی سمت، یا پھر
اسی اُلٹ پھیر میں بھلائی سے معصیت تک!

میں فیثا غورثؔ کا زاویہ قائمہ ۱ نہیں ہوں
کہ جس کی تشکیل میں تبدّل کا کوئی بھی شائبہ نہیں ہے
(عمود ۲ اور قاعدے ۳ کی لمبائی کا مربع
وتر ۴ کی لمبائی کے مربعے سے ہی رقم ہے!)
کہ میں تو ماہِ تمام ہوں جو کہ
قرص و قامت کی اپنی اقلیم میں
گھٹے گا تو گھٹتا جائے گا رفتہ رفتہ
ہلال سے پیش رفت کرتا ہوا بڑھے گا
تو پھر سے ماہِ تمام بن کر طلوع ہو گا!
میں زاویہ قائمہ نہیں ہوں!!

....

Right-Angled Triangle 2.Perpendicular 3. Base.1

Hypotenuse.4

Mater Amoris

میتر ایموری

(لاطینی۔ "پیار کرنے والی ماں")

اضطراری کیفیت میں چھٹپٹاتی، کسمساتی
دردِ زہ میں زور سے پھنکارتی
اپنی زباں کو لپلپاتی
چکنے، دھاری دار، بل کھاتے ہوئے
قابو سے باہر، جسم کو جیسے تشنج میں پٹختی
ایک مادہ افعی بارہ سنپولوں کو جنم دیتے ہوئے
ان کو نگل جانے کی خاطر
دائیں بائیں سر گھما کر دیکھتی ہے
کچھ تو نگلے جا چکے ہیں
اور کچھ بچتے بچاتے گھاس میں گم ہو گئے ہیں!

افعی، کیا 'نر' تھا یا 'مادہ' تھی، جس نے
جنتِ پارینہ یا باغ جناں میں چکنی چپڑی گفتگو سے ورغلا کر

مادرِ انسان کو تخلیق کے اصلی ہنر کا راز سمجھایا تھا، لیکن
اماں حوا سیکھ کر بھی اپنے دو نو زائدہ بچوں کو
جیسے کھاتے کھاتے رک گئی تھی...

شفقتِ 8 مادر تھی یا پھر ''افعی انسان'' کی مادہ سے یہ سہو اُہوا تھا
آلِ آدم آج بھی اس 'سہو' کا پھل چکھ رہی ہے
بھائی اپنے بھائیوں کا خوں بہاتا جا رہا ہے
کون ہے، ہابیل یا قابیل، قتلِ عمد کا مجرم؟ کوئی کیسے بتائے!

....

موزارت سوناتا نمبر ۱۱

(صوتی محاکات پر استوار ایک شعری تاثر)

مدھم مدھم
دھیرے دھیرے
صحرا میں سورج کی آڑی ترچھی کرنیں
نالاں، شاکی
اپنے ترچھے سایوں کی پسپائی پر
اب سبک سبک کر

اُلٹے پاؤں چلتے چلتے
دور افق میں ڈوب گئی ہیں
ایک نئی ہلکی ''سُر لہری''
نرم فضا میں تھر تھر کرتی
جنباں، لرزاں، افتاں، خیزاں
خاموشی کی پرتوں میں نیچے سے اوپر ابھر رہی ہے
مہر بلب۔۔ پھر سائیں سائیں سرگوشی سی
مِن مِن، کِن کِن، گلوگیر
شیریں، زہریلی
ناگ پھنی کا رس امرت
کانوں کو ٹپ ٹپ گھول پلاتی
لوری کی لَے میں اک ''ٹھاٹ'' سا
قطرہ قطرہ۔۔ صوت کا شربت
زہر سا میٹھا
شہد سا کڑوا
کان گپھا میں ٹپک گیا ہے
سُر کی گت 'اُپ ناس' میں الجھی
ناگ پھنی کے کیل کانٹوں سے لیس بدن پر
سرک سرک کر
ناگن کے آگے بڑھنے کے سُر سنگیت سی گونج گئی ہے

مرتے مرتے یہ آلاپ اب

انتم سانس میں

مجھ کو بھی

چُپ چاپ سمادھی کی حالت میں چھوڑ گیا ہے!

....

ساکھشی شروتی اور سمرتی

(’’تتھاگت‘‘ سلسلے کی ایک نظم)

’’سمرتی‘‘؟ یاداشت پر مبنی؟

’’شروتی‘‘؟ یعنی کانوں سے سُنی؟

یا’’ساکھشی‘‘؟ آنکھوں سے دیکھی؟

کس میں کتنا جھوٹ ہے، کتنی حقیقت؟

جب تتھاگت بُدھؔ سے آنند بھِکشو نے یہ پوچھا

تو وہ بولے

تُم تو، بھِکشو. ساکھشی • بھی ہو مری باتوں کے (ناظر)

مجھ کو دیکھ کر پہچانتے ہو

اور ''شروتا'' • بھی ہو، میرے (سامع)
کان بھی دھر کر مری باتوں کو سُنتے ہو ہمیشہ
اور اپنی ''سمرتی'' • میں (یاداشت)
ساری باتیں یاد بھی رکھتے ہو میری
کل کلاں میں چل بسوں گا
تم مری باتوں کو اپنی یاد میں محفوظ رکھ کر چھوڑ دوگے...
کچھ دنوں کے واسطے ماتم کروگے
اور پھر جب
اپنے تبلیغی سفر پر
گاؤں گاؤں گھومتے پھرتے ہوئے
تم اپنے اپدیشوں میں میرا نام لوگے
میری باتوں کے ویاکھانوں کو دہراتے پھروگے
تم کہوگے، ہاں، تتھاگت پاپ کے بارے میں بھی فرماتے رہے ہیں....
تم کہوگے، ہاں، تتھاگت جنّت و دوزخ کے بارے میں بھی یہ فرماگئے ہیں....
تم کہوگے، ہاں، یقیناً، ایشور کے ضمن میں ایسے کہا تھا
''ایشور بس ایک مفروضہ ہے، اک ہستی نہیں ہے۔''

تم کہوگے، ہاں، تتھاگت نے کہا تو تھا،
قبولیت کی کوئی حد نہیں ہے
جو ملے دنیا میں، سب سویکار کرلو...
تم کہوگے.........

تم کہو گے........

تم کبھی خود کو ہی دہراتے ہوئے یہ بھول جاؤ گے
کہ پہلے کیا کہا ہے۔
اور کبھی یادداشت پر مبنی تمہاری بات اس تعلیم کو جھٹلا بھی دے گی
جس کو جھولی میں بھرے تم پھِر رہے ہو۔
کل کلاں یہ 'سچ' یقیناً 'جھوٹ' میں تبدیل ہو گا،
یہ سمجھ لو
'ساکھشی' ہونے کا سچ ہی معتبر ہے!

بہ نوکِ خار می رقصم

بہ نوکِ خار می رقصم۔ کہا اس نے
بہ نوکِ خار می رقصم۔ بڑے اندوہگیں لہجے میں دہرایا

کہا میں نے، یہ نوک خار آخر کون سے افلاک پر بچھتی ہے
..اس کمرے کے غالیچے تو اونی ہیں

اردو محفل

کہا اس مہرباں نے، میری حالت ان سے بھی بد تر ہے
وہ سب درویش جو کانٹوں کی نوکوں پر
برہنہ پا سراپا گھومتے ہیں، رقص کرتے ہیں
انہیں وجدان میں کچھ بھی نہیں محسوس ہوتا، پر
میں تو دنیا دار ہوں، بیوی ہے، بچے ہیں
منافع بخش تو شاید نہیں، لیکن بطور شغل اک سادہ سا کاروبار بھی ہے
بنک کے چکّر، ادائی اگلے قرضوں کی، نئے قرضے
وصولی بیچکوں کی، ہر مہینے ورکروں کو کیش پیمینٹ
صرف و اخراجات باہر کے، کئی پرچون کھاتے
اور انکم ٹیکس کا چکّر..... ذرا سوچیں، مرے بھائی
نجانے کتنے لوگوں کو تحائف دینے پڑتے ہیں
ذرا سے ٹیکس کی چوری..... یقیناً جانتے ہیں آپ، بھائی
دہرے کھاتے سب تو رکھتے ہیں!

انہی کانٹوں پہ بھائی روز چلتا ہوں
غلط کیا کہہ دیا میں نے..... بہ نوکِ خار می رقصم!

....

گیارھواں طاعون

میری آنکھوں کو اندھا کرنے کی خاطر
گرم سلائیاں لے کر آئے ہو، تو سُن لو
مصر کے دس طاعون تو بینائی سے عاری میری آنکھیں
صدیوں پہلے دیکھ چکی ہیں
دیکھ چکی ہیں
خاک و خون میں لتھڑے ابو الہول کے لشکر
جن کے لاشے پٹے پڑے تھے اہراموں کے چاروں جانب
ریگستانوں میں بہتی تھیں خون کی لہریں
نیل میں آگ کی جلتی لہریں
دس طاعون جو باری باری آئے تھے۔ وہ
لاکھوں جانیں لے کر آخر لوٹ گئے تھے!

اپنی بینائی کھو کر میں
اندر کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا ہوں
دیکھ رہا ہوں
اک طاعون جو دور افق پر چڑھ آیا ہے
مردو خور پرندوں کی کالی آندھی سا

اس طاعون میں ایک مصر کیا
اس خطے کی ساری دھرتی ٹوٹ پھوٹ کر یوں بکھرے گی
تیل کے کوئیں، دریاؤں کے پاٹ، خلیجیں اور جزیرے
ابل ابل کر، باہر آکر
باقی کی آدھی دنیا بھی لے ڈوبیں گے
مصر کے دس طاعون تو عشرِ عشیر نہیں تھے
اس طاعون کا، جس کو میری اندھی آنکھیں
اپنے کالے پر پھیلائے اڑتا آتا دیکھ رہی ہیں!

کہا جاتا ہے کہ فرعون مصر نے ایک پیش بین holy seer کی آنکھیں، جس نے طاعونوں کے آنے کی پیشین گوئی کی تھی، گرم سلاخوں سے اندھی کروادی تھیں۔ یہ نظم ٹیونیشیا، مصر، لیبیا اور دسرے عرب اور شمالی افریقہ کے ممالک میں 2011ء کی عوامی بغاوتوں سے دوسال پہلے لکھی گئی۔

(افغانستان کے لیے تین نظمیں)

(ایک) کھیت میں کیا بم اُگیں گے؟

ننھے ننھے بیج بوئے
اس نے موروثی زمیں میں

اور ان خشخاس کے دانوں سے جب پودے اُگے، تو
ان کے ڈوڈوں سے نکلتا سوم رس.......
اس کو لگا جیسے کہ آبِ چشمۂ حیواں ہو
اسکندر کی منزل!

تب بنے پودوں کے پتے تیز خنجر
اور ڈوڈے ہینڈ گرنیڈوں کا آتشگیر مادہ
اور پھر گہرے گڑھے میں
دودھ پیتا اپنا بچہ اس کو بونا پڑ گیا
کرتا بھی کیا دہقان آخر؟

اور پورے چاند کی اک رات کو
دہقان پھر مجبور تھا، بیٹی کو اپنی
کانپتے ہاتھوں سے اس نے
کھیت میں اک بیج کی مانند بویا
اور اس نے کانپتے ہاتھوں جب یہ کر دیا، تو
بیج سے شعلے اُگے اور پھر وہی چکّر
وہی پودے، وہی ڈوڈے

وہی ڈوڈوں سے رِستا سوم رس، جو

اس کی روزی کا وسیلہ بن چکا تھا

آج اس دہقان نے اپنا بدن بھی بو دیا ہے
کھڑکھڑاتی ہڈّیوں اور لپلپاتی آگ کے شعلوں میں لپٹا
ایک بم سا!
آگ کے اس بیج سے کیا
پوست کے پودے اُگیں گے

....

(۲) ''رَیتونادے'' یا چوہوں کا شکار۰۰

چوہے بِل میں چھُپ گئے ہیں
ایک چوہا ایک بِل؟ یا بِل کے نیچے
دوسرے چوہوں کے چھُپنے کے لیے
اک غار، کھائی، ایک پوشیدہ ٹھکانہ!

میں جو نفرت کے برہنہ خول میں
گرنیڈ سا لپٹا ہوا پھینکا گیا ہوں

لاکھ غاروں سے دریدہ اس پہاڑی ملک میں
مغرب کے گورے ملک سے
یہ جانتا ہوں، ایک چوہا مر بھی جائے
لاکھ چوہے ان بِلوں سے اور نکلیں گے
ہماری ہڈّیاں تک نوچ کھانے کو
مگر میں خوف سے لرزاں نہیں ہوں
میں شکاری ہوں، مرے گرنیڈ اور خودکار راکٹ
آج تک چُوکے نہیں ہیں
درجنوں چوہے مرے ہاتھوں سے اب تک مر چکے ہیں
کیا کہا؟ اک لاکھ چوہے؟
لاکھ چوہے بھی کہاں جائیں گے
توپوں اور ہوا سے مار کرتے
'ڈرون' طیّاروں سے بچ کر؟
میرا یہ ہنٹِنگ ٹرِپ•• یا 'رَیتونادے' ایک دن تو ختم ہو گا!

....

• الجزائر کی جنگ آزادی کے دوران فرانسیسی اصطلاح Ratonnades گھڑی گئی۔ اس کا ترجمہ "چوہوں کا یا الجزائر کے مسلمان حریت پسندوں کا شکار" ہے۔ (س پ آ)

••Hunting Trip

کٹ، کٹ اور کٹ

فلم بندی کی تکنیک میں یہ نظم پہلے انگریزی میں لکھی گئی)

مال برداری کے گھوڑوں کے لیے
گہرے اندھیرے غار میں افیون کی اک کھیپ
بوروں میں بندھی ہے
رائفل بردار اک افغان کچھ دوری پہ بیٹھا
انعکاسی دوربیں سے دیکھتا ہے

دوسرے اک غار میں اک اور 'طالب' چارپائی پر پڑا ہے
دایاں کندھا خون سے لتھ پتھ ہے

گولی کند چاقو سے نکالی جا چکی ہے
نیم بے ہوشی میں اس کی بڑبڑاہٹ
'دغاروڑا دغاروڑا' کی صدائیں

غار کے اندر بھٹکتی پھر رہی ہیں

CUT

دور مغرب میں افق پر زنگ جیسے خون کی چادر بچھی ہے

چند چیلیں (یا چڑیلیں) اڑتے اڑتے

ڈوبتے سورج کو گالی بک رہی ہیں

غار سے جگنو نکلتے ہیں تو لگتا ہے

کلاشنکوف سے فائر ہوئے کچھ قمقمے

چکّر پہ چکّر کھا رہے ہوں!

CUT

گاؤں گاؤں لشکرِ جرّار، چھاپہ مار دستے، ٹڈّی دل سے

ٹولیوں میں گرتے پڑتے گھومتے ہیں

عورتیں، بچّے، ضعیف العمر کبڑے مرد بھی شامل ہیں ان میں

اور پھر یکدم ہوا میں حرکت وحدت میں کچھ بیشی ہوئی ہے

مغربی جمہوریت کے اک مشینی بھوت نے

اپنی عقابی آنکھ سے دیکھا ہے۔ اور پھر

ڈرون طیّارے سے دو میزائل داغے ہیں

جو سیدھے ہدف پر جا کر پھٹے ہیں

دوڑو بھاگو! ایک بھگدڑ مچ گئی ہے

گرتے پڑتے لوگ بھاگے جا رہے ہیں
اور پھر کچھ مردار خور اپنے افق سے اُڑتے آتے
اپنی چونچوں میں لیے نیپام کے گولے
فلک پر چھا گئے ہیں
CUT

پوست کے پودے اکھڑ کر کھیت میں ہی جل گئے ہیں
پوست کے ڈوڈے سلامت بچ نہیں پائے
کہ اجڑے کھیت میں تپتی، سلگتی راکھ ہے
اور کچھ نہیں ہے!
FADE OUT

....

مختصر مختصر نظمیں

(ان نظموں کے استعاراتی معانی عنوانات میں تلاش کیے جائیں)

(۱)برہنہ مجذوب

شاید مجھے بھی

سرمدی خلعت نصیب ہو

اب تک تو

سوٹ بوٹ ہی میری شناخت ہے!

---

(۲)قُقنُس

اک شعلۂ جودت تھا

کل اپنی جگہ تھا

اک راکھ کی ڈھیری ہے

آج اپنی جگہ ہے!

(۳) دعا در خانقاہ

میں انتظار میں تھا
کب جواب آئے گا
پتہ غلط تھا
لفافہ مرا پلٹ آیا

---

(۴) اماں حوّا کی پوشاک

جاؤ، یہ زندیق سا مکروہ، سفلی پھل
(جسے تم چکھ چکی ہو)
اس کو لوٹا دو
مگر میرے لیے بے حد ضروری ہے
کہ وہ اتری ہوئی پوشاک جیسی پاکبازی
جس کو تم ابلیس کے پاؤں پہ رکھ کر
پاس میرے آ گئی تھیں

اس سے واپس مانگ لاؤ!"

---

(۵) آستین میں خنجر

"کیا بروٹس تُو بھی....؟"••

میرے لب پہ آیا

اور پھر یہ ساکت و جامد

ادھوری بات آخر

آہ میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی

پیٹھ میں گھونپے ہوئے

خنجر سے میں کیا پوچھتا

اس کے علاوہ؟

••Et tu Brutus? " (Shakespeare: Julius Caesar)"

(۶)موت کو یہ بھی علم نہیں ہے

انکھوے پھوٹے

بُور آیا....

پھر پھل آئے

میٹھے، نرم، سجیلے، رنگیں

شوخ پرندوں، لو بھی انسانوں نے کھائے

بیج نکل کر چاروں سمت زمیں پر بکھرے

جذب ہو گئے

موت مجھے کہتی ہے، تیرا انت آ گیا

موت کو یہ بھی علم نہیں ہے

اس کے ہاتھوں مرنے والا

کتنے جیون اور جیے گا!

....

(۷) دوسرا راستہ

نیم خمیدہ، قوسی، محرابی رستوں پر چلتا چلتا
ایسے موڑ پہ آ پہنچا ہوں
جس سے دو شاخوں میں رستہ بٹ جاتا ہے
دونوں رستے جیسے استقبال کو میرے بچھے ہوئے ہیں
پہلا رستہ نرم، ملائم لہجے میں مجھ سے کہتا ہے
دیکھو اپنے ٹوٹے پاؤں، دریدہ تلوے
انگ انگ میں سو جنموں کی دوڑ دھوپ کی تھکن، ماندگی کو پہچانو
اپنے قدم بڑھاؤ مخمل جیسے مجھ ہموار راستے کی چھاتی پر
تم کو ابدی نیند ملے گی
سو جاؤ گے!
دوسرا رستہ کانٹوں جیسے چبھنے والے
لہجے میں مجھ سے کہتا ہے
خار و خس سے لدا ہوا میں
اونچا نیچا، ٹیڑھا میڑھا
اس دشوار گذار بڑھاپے کا رستہ ہوں
جس پر تم کچھ سال ابھی چل سکتے تو ہو
لیکن مجھ پر چل سکنا آسان نہیں ہے
ہمت ہے تو پاؤں بڑھاؤ!

میں سیلانی

حاجی، زائر.... طائف، آوارہ، بنجارا
سیمابی رفتار سے چلتا
دوسرے رستے پر بڑھتا، خود سے کہتا ہوں
دیکھوں تو پیری کا رستہ
کتنا مشکل یا آساں ہے!!

....

(۸) قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

اپنے نڈھال جسم سے کہتا ہوں میں اکثر
باغِ ارم ہے، ایک خیاباں ہے یہ جہاں
تُو مرغزارِ زیست کا وہ مرزبان ہے
جو ذوق و شوق، تاب و تواں میں تھا مستعد
جس میں قرار تھا نہ تعطل نہ کاہلی

طوفاں میں بھی جو بر سرِ پرواز رہا تھا
جو آشنا نہ تھا کبھی فرصت کے نام سے!

اپنے نڈھال زدہ جسم سے کہتا ہوں کہ اُٹھ، چل

مت دیکھ یہ بکھرے ہوئے بیکار سراپے
جو ماندگی سے مضمحل ہر سمت پڑے ہیں
پسپائی کے مارے ہوئے یہ لوگ ہیں ناکام
تو ان کی طرح بے عمل، بے کار نہیں ہے
اٹھ چل کہ ابھی تک تری منزل نہیں آئی
اٹھ چل کہ تجھے راہ میں رکنا نہیں ہے آتا!
جنت بدر ہوا تو ہوں لیکن درونِ دشت
"قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم!"

....

(۹) اک آیتِ آئندہ

اک آیتِ فردا تھا
کل تک تو مرا لہجہ
اک آیتِ آئندہ
بننے کو تڑپتا تھا
اور آج جب آئندہ
اک لمحۂ حاضر ہے
کاٹی ہوئی زباں کو
دانتوں تلے دبائے

چُپ چاپ مَیں کھڑا ہوں

منہ سے لہو رواں ہے!

....

(۱۰)ہجرت

پچیس سال پہلے

اس ملک کے دروازے

کوتاہ قد تھے اتنے

مجھ جیسے قد آور کو

اپنا کلاہِ عظمت

دستارِ اوّلیت

باہر ہی ترک کر کے

جانا پڑا تھا اندر

اس ملک کے دروازے

اتنے سکڑ گئے ہیں

اب مجھ کو اپنا سر بھی

شاید کٹانا ہو گا!

....

(۱۱) سکوتِ سخن شناس

تحسینِ وخایہ بوسی
ملتی رہی ہے مجھ کو
کچھ ناشناس قاری
کہتے رہے ہیں "چہ خوش"
لیکن مجھے بتاؤ
اے ناقدانِ اردو
آیا سخن شناسی
اک قدرِ صُمِ بُکم ہے؟

....

نو، نیاز آمدہ

میں آج بد نما، گھسا پٹا ہوا
پُرانا، مَیل خوردہ سکّہ ہوں... مجھے

چھُوا ہے سینکڑوں غلیظ انگلیوں کے مَیل نے
مجھے بھرا گیا ہے
گندی تھیلیوں میں، بٹوؤں میں ٹھونس کر سدا
مجھے دیا گیا ہے کاروبار، لین دین میں، حوالگی میں، قرض میں
میں ایک ہاتھ سے کسی بھی دوسرے میں
رخصت ووداع کے بغیر منتقل ہوا ہوں عمر بھر
ہزاروں گندے ہاتھوں کے پسینے کی تہیں سی جم گئی ہیں میرے جسم پر
مری جبیں بھی، پشت بھی
کچھ ایسے مسخ ہیں کہ اب تو کھوٹا ہونے کا گمان
بھی ہُوا ہے میرے لین دین میں
میں روپیہ ہوں، پاؤنڈ بھی ہوں، مُہر بھی، ریال بھی
نہ جانے کب گھڑا گیا تھا، یاد تک نہیں مجھے!

میں جب گھڑا گیا تھا ٹھوس دھات سے
سفید، نقرئی، روپہلا، چمپئی
سنہرا، جاذب نظر تھا، صاف اور کھرا تھا میں
یہ سادگی کا حسن تھا
کہ میری پرکھ میری تازگی میں تھی
کسی غلیظ ہاتھ نے نہیں چھُوا تھا میرے صاف جسم کو
کسی بھی جیب کی سڑاند، تھیلیوں کی بُو نے میرے
اُجلے پن کو بدنُما نہیں کیا تھا... اور میں

نیا تھا، نو بہ نو تھا
ایک نونہال طفل سا!
یہ لفظ "نونہال" مجھ کو کیسے یاد آ گیا؟

میں ایک سکّہ؟ ایک نونہال سا؟
نیا، نویلا، ۔۔۔ ایک بچہ، صغر سن؟
اچھوتا، کورا، نو نیاز آمدہ؟

میں آدمی کی نسل، ایک طفل نو؟
چمک دمک میں جو کبھی نئے گھڑے ہوئے سفید سکّے سا کھرا تھا، پر
تمام عمر کے غلیظ لین دین نے مجھے
ذلیل، خستہ حال، رنگ باختہ بنا دیا!

موازنہ بھی کیا عجیب چیز ہے!!

....

طفلِ سِن رسیدہ

سو برس کا میں کب تھا، منشیِ وقت؟

کب نہیں تھے؟ ذرا بتاؤ تو
تم یقیناً کہو گے، بچپن میں
کھیلنے کودنے میں وقت کٹا
جب شباب آیا تو؟... کہو، ہاں کہو
کیا برومند، شیر مست ہوئے؟
کیا جفاکش تھے؟ بے جگر؟ کرّار؟
آمرِ وقت کو کوئی چیلنج؟
سرکشی تختِ مستبد کے خلاف؟
کیا رہے یار باش لوگوں کی
صحبتِ ناؤنوش میں مدہوش؟
جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں!
تم رہے بند کتب خانوں میں
وہ کتابیں بھی چاٹ لیں تم نے
جن کو دیمک نے بدمزہ سمجھا!
اس جوانی میں تم رہے مصروف
(جس میں سب لوگ عیش کرتے ہیں!)
منطقی پخت و پز کی کاوش میں!
لفظ بینی کی خشک عادت نے
موٹے چشمے سے ڈھانپ دیں آنکھیں!!

تم نے سیکھے عجب ذہانت سے
اُتر میمانسا، سمکھیا، یوگ
نیائے، ویدانت اور گیتا گیان
فکر فی نفسہ، ارتسام و خیال
عینیت، مادیت، ورائے وجود

صوفیانہ مراقبہ، عرفان
بودھی اثباتیت، سمادھی، دھیان....

......یہ کہولت زدہ بزرگی کے
گرد آلود فلسفے ہیں، جنہیں
اپنی نوخاستہ جوانی میں
تم نے سر میں انڈیل کر سوچا
"اب کلیسا، کلس، حرم، مینار
جامعات اور ان کا بحرِ علوم
میری جاگیر ہیں، مری املاک
میں ہوں ذی علم، جیدِ عالم!"
زیست کا نیم پختہ آدھا گیان
کلمتہ الحق سمجھ لیا تم نے
اور اک جست میں لڑکپن سے
ہو گئے پیر زال، شیخ البیت!

منشیِ وقت نے کہا.... دیکھو
تم نے حدِ بلوغ سے پہلے
اپنی بے رِیش کم سنی کے فقط
بیس برسوں میں جی لیا صد سال
اور اب طفلِ سِن رسیدہ ہو!

....

ایک پہیلی دوجی کو کیسے بوجھے گی؟

نوے فی صد پانی
کچھ کچھ آگ، ذرا سی مٹّی
پھونک برابر سبک ہوا کا اندر باہر چلنا پھرنا
ذرّہ بھر آکاش، ذہن میں جگمگ کرتا
نور کا قطرہ
اک خاکہ، اک جسم، ہیولا
لیکن اک اسرار، پہیلی!

اوپر، نیچے، چاروں جانب

غیر معین، لامحدود آفاق کے باسی
ether اوڑھے، چلتے پھرتے
اربوں کھربوں سورج، چاند، ستارے
ظاہر، واضح، جلوہ نما، اک عالم، لیکن
اک اسرار، پہیلی!

ایک پہیلی دوجی کو کیسے بوجھے گی؟

''

(لاہور اور امریکا.... ٹیلیفون پر آپس میں فون پر باتوں باتوں میں ابھرے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا کے ایک خیال پر مبنی یہ نظم انہیں بہت پسند تھی)

آرتی

(بنارس میں قیام کے دنوں کی یاد میں)

اس برس بھی وہ کھڑی تھی گھر کی چوکھٹ پر
ہمیشہ کی طرح ہی آج دیوالی کے دن کی
نرم، ہلکی دھوپ میں جیسے نہاتی

تھال میں گھی کا دیا، صندل، سگندھی، عود

ہلکی سوندھی خوشبو کے ہلورے
زعفراں کی پتّیاں، سیندھور، افشاں
پان کا پتّہ....
آرتی کے سب لوازم تھال میں تھے

گیلی دھوتی گورے گدرائے ہوئے انگوں سے
یوں چپکی ہوئی تھی، جسم کا حصّہ ہو جیسے
گنگا میّا کا یہی وردان تھا، اشنان کر کے
ہر برس معبود کے در پر پہنچ کر آرتی اس کی اتارے!

ایک دستک!
اور پھر جیسے کوئی اندر کھڑا ہی منتظر ہو..... کھل گئے در
کوئی اس کے سامنے تھا

اس کی نظریں پاؤں سے اوپر اٹھیں
چہرے پہ اک لمحے کو ٹھہریں... اور پھر
پیروں پہ ہی مرکوز ہو کر رہ گئیں
پاؤں ہی جیسے فقط پوجا کا معبد، دیوتا ہوں

عود اور لوبان، صندل
دیپ اور مشٹھان ۰، دھونی کا سگندھت ۰ ایک جھونکا

آرتی معبود کے چرنوں کی تھی.... ٹیکا لگایا
آرتی پوری ہوئی تو
اس نے پھر اک بار اوپر دیکھ کر نظریں جھکا لیں
"آؤ، استقبال ہے، دیوی تمہارا
اس برس بھی کیا نہیں آؤ گی اندر؟"

پر پجارن ساری سامگری • کو چوکھٹ پر ہی رکھ کر
اور خالی تھال کو ہاتھوں میں لے کر
الٹے پاؤں لوٹ کر گنگا کنارے جا رہی تھی!

....

وہ کہاں ہے؟

(یونیورسٹی سے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد لکھی گئی)

جامعہ کے کاریڈوروں میں خراماں
دیکھنے میں سرد دھیمی آگ میں جلتے ہوئے سائے سا، پر
گاہے بگاہے لپلپاتا، اونچا اٹھتا ایک شعلہ!
لمحے بھر کو تند خو، آتش دہاں....

خاموش دھیمی آگ میں اک بار پھر
جلتے ہوئے سائے کے پیکر سا
وہ اپنے آپ میں گم

پیر سالہ شخص اس منظر سے غائب ہو گیا ہے!

اب کہاں ہے وہ جسے علم و ادب کی محفلوں میں
بحث میں، تقریر میں
لفظوں کے سُر سنگیت میں
ایسی مہارت تھی، کہ اس کے دوست، دشمن سارے لوہا مانتے تھے

اب کہاں ہے جامعہ کے کتب خانے کا وہ ساکن؟
اب کہاں ہے سیمیناروں کا وہ ساین پوسٹ جس کو دیکھ کر ہی
علم ہو جاتا تھا کہ طلبہ جوق اندر جوق
کس کمرے کی جانب جا رہے ہیں

اب کہاں ہے وہ؟

....

(نظم لکھنے کے بعد میں نے خود سے پوچھا، ''اگر یہ شخص میں خود نہیں تو اور کون ہے؟)